سعودی عرب میں ۲۳ سال

مشاہدات و تاثرات

سید محمد عبدالرشید ندوی

SAUDI ARABIAN السعودية

سعودی عرب میں ۲۳ سال

مشاہدات وتاثرات

سید محمد عبدالرشید ندوی

ناشر

فرید بکڈپو (پرائیویٹ لمیٹیڈ)

۲۱۵۸، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس

دریا گنج، نئی دہلی-۲

سعودی عرب میں تئیس سال

تفصیلات

نام کتاب: سعودی عرب میں ۲۳ سال، مشاہدات وتاثرات

نام مصنف: سید محمد عبدالرشید ندوی

کمپوزنگ: ندوی کمپیوٹر سروسیز، ندوہ روڈ، لکھنؤ-۲۰

ناشر: فرید بکڈپو، دہلی

سنہ اشاعت: اپریل ۲۰۰۷ء

پہلا ایڈیشن: ۱۰۰۰

قیمت:

ملنے کے پتے

۱- مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ (یوپی)

۲- الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ (یوپی)

۳- مکتبۃ الشباب الحدیثۃ، برولیا، ٹیگور مارگ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

فہرست عنوانات

۱	مقدمہ	۵
۲	پیش لفظ	۸
۳	مدینہ منورہ خواب وخیال میں	۱۲
۴	رباط (مراکش) کے خط کی فوٹو کاپی	۱۲
۵	مدینہ یونیورسٹی کے خط کی فوٹ کاپی	۱۷
۶	وزارت تعلیم وسماجی بہبود کے خط کی فوٹو کاپی	۱۹
۷	سعودی سفیر کے خط کی فوٹو کاپی	۲۰
۸	رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے خط کی فوٹو کاپی	۲۳
۹	نیشنل ایوارڈ کے اطلاعی خط کی فوٹو کاپی	۲۵
۱۰	الوداعی نظم	۲۷
۱۱	ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا	۳۰
۱۲	دیرآید درست آید	۳۶
۱۳	پہلا عمرہ اور زیارت مسجد نبوی	۳۸
۱۴	سعودی عرب: ایک معاشرتی جائزہ	۴۱
۱۵	سعودی عرب: ایک عام جائزہ	۴۴
۱۶	جامعہ کے چار سالہ تعلیمی دور کی بعض اہم علمی وثقافتی سرگرمیاں	۴۸
۱۷	سفر ہفوف	۵۸

۱۸	جمعہ کی نماز سنگینوں کے سائے میں	۶۳
۱۹	طالب علمی سے ملازمت تک	۶۵
۲۰	صدر ضیاء الحق کے نام ایک خط جو پوسٹ نہ ہوسکا	۶۹
۲۱	کمپیوٹر کا تعارف	۷۲
۲۲	بعض ملکی وغیر ملکی تاریخی واقعات وحادثات	۷۷
۲۳	اور جنگ چھڑ گئی	۸۰
۲۴	بمبار جہازوں کے سائے میں دہلی کا سفر	۸۳
۲۵	بابری مسجد کی شہادت	۸۶
۲۶	بابری مسجد	۸۹
۲۷	ریاض میں ''آل انڈیا ملی کونسل'' کی تشکیل	۹۱
۲۸	ریاض میں ''مجلس ابنائے ندوہ'' کی تشکیل	۹۲
۲۹	سعودی عرب کے چند قابل اصلاح پہلو	۹۵
۳۰	سعودی عرب کے چند روشن وتابناک پہلو	۹۷
۳۱	مجمع ملک فہد کا قیام	۱۰۱
۳۲	حرمین شریفین کی توسیع	۱۰۲
۳۳	حرم مدنی	۱۰۳
۳۴	حرم مکی	۱۰۴
۳۵	حرفِ آخر	۱۰۷

مقدمہ

ڈاکٹر سید محمد عبدالعزیز

ایم-اے، ایل-ایل-بی، بی-ایم-ایس

پیش نظر کتاب سید محمد عبدالرشید حسینی ندوی سلمہ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو سعودی عرب سے متعلق انھوں نے لکھے تھے، اور ماہنامہ ''امکان'' لکھنؤ اور ماہنامہ ''بانگ حراء'' میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔

وہ ۱۹۷۷ء میں تعلیم حاصل کرنے سعودی عرب گئے تھے پھر وہیں ''منسٹری آف ڈیفنس'' کے شعبۂ کمپیوٹر میں ملازم ہوگئے، ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک وہاں کام کرتے رہے اور ۱۹۸۹ء میں ''رائل سعودی نیوی فورسیس'' میں منتقل ہوگئے اور اگست ۲۰۰۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔

ان کا تعلق قصبہ کوڑہ جہان آباد، ضلع فتحپور (ہسوہ) کے اس سادات گھرانے سے ہے جہاں سیکڑوں، علماء، صلحاء، فضلاء اور داعیان وشیوخ طریقت پیدا ہوئے، جن میں سے بعض مشہور حضرات یہ ہیں:

حضرت سید شاہ قطب الدین سالار بڈھؒ، حضرت شاہ بہاء الدین، حضرت شاہ علاء الدینؒ عرف شاہ حسین، حضرت شاہ بہاء الدین، حضرت شاہ علاء الدین، حضرت شاہ حمید الدین عرف مخدوم جہانیاں ثانیؒ، شاہ قطب الدین ثانیؒ، حضرت شاہ جمال اولیاءؒ، حضرت شاہ مبارکؒ، حضرت شاہ حمید الدین عرف شاہ مخدوم ثانیؒ، حضرت شاہ عبدالکریم، حضرت شاہ حسین ثانیؒ، شاہ محمد ہاشمؒ، شاہ ابوالمعالیؒ، شاہ ابونجیبؒ، شاہ ملا عبدالرسولؒ، شاہ جلالؒ، شاہ خرمؒ، شاہ مخدوم عالمؒ، شاہ ابونجیبؒ، ملا محمد واصلؒ، شاہ محمد فیروزؒ، مخدوم جہانیاں ثالثؒ، ملا محمد واصلؒ، شاہ ابوسعید عرف بھبے دانشمندؒ، سید نور الدین حسنؒ، سید نور الحقؒ، ملا محمد واصلؒ، محمد عادلؒ، شاہ صبغت اللہؒ وغیرہ۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب ''قصبہ کوڑا، تاریخ وشخصیات'' مؤلفہ مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ)

پچھلی صدی ہجری میں کوڑہ کی تین شخصیتوں نے ملک وملت پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے:

مولانا سید شاہ وارث حسنؒ صاحب ٹیلہ والی مسجد لکھنؤ کی مسند ارشاد واصلاح پر سالہا سال متمکن رہے، اور حکیم سید نصرت صاحبؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے رفیق سفر اور مالٹا میں رفیق سجن واسارت رہے، اور وہیں انتقال کیا، اور وہیں مدفون ہوئے، مولانا سید محمد

عبدالحئی صاحبؒ نے پیشاور سے لے کر کلکتہ، اور کشمیر سے لے کر جنوبی ہند تک دین کی دعوت اور اس کا پیغام پہنچایا، وہ جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کے بانی وروح رواں میر غلام بھیک نیرنگ مرحوم کے بڑے معتمد اور انجمن کے معتمد تبلیغ تھے، اور پھر جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام، کانپور کے جنرل سکریٹری ہوئے، جس کا مقصد اس وقت شدھی سنگھٹن کی تحریک ارتداد کا مقابلہ کرنا تھا جو پورے ملک میں آندھی طوفان کی طرح اٹھی تھی، اس سلسلے میں جمعیۃ نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔

اسی مشہور خاندان کے یہ چشم وچراغ ہیں، انہوں نے سب سے پہلے دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی، وہیں سے ''عالمیت'' اور فضیلت کا کورس مکمل کیا، اسی دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ''ہائی اسکول'' کا امتحان، اور جامعہ اردو علی گڑھ سے ''ادیب'' اور ''ادیب ماہر'' کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے ''فاضل ادب'' اور بی اے، فرسٹ ڈیویزن امتیاز In order of Merit سے پاس کیا، اور ۱۹۷۷ء میں وہیں سے بی-اے (آنرز) فرسٹ ڈیویزن سے پاس کیا، پھر ۱۹۷۷ء ہی میں مزید تعلیم کے لئے سعودی عرب چلے گئے وہاں سے حدیث وتفسیر میں ایم-اے کیا، اور ۱۹۸۰ء میں وہیں ملازمت کر لی۔

انھوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے مضامین لکھنے شروع کر دیئے تھے، جو ہندوستان، پاکستان، لندن کے مختلف اخبار ورسائل اور مجلّات میں شائع ہوتے تھے جن میں سے، ماہنامہ ''فاران'' لندن، پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ، ماہنامہ محکمات لکھنؤ، ماہنامہ ''سوبرس'' دہلی، پندرہ روزہ ''ملی اتحاد'' دہلی، ماہنامہ بانگ حراء لکھنؤ، ماہنامہ امکان لکھنؤ، روزنامہ ''جنگ'' کراچی، ''سیارہ ڈائجسٹ'' لاہور، اردو ڈائجسٹ، لاہور وغیر قابل ذکر ہیں۔

موصوف فی الوقت جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور کے جنرل سکریٹری، ندوہ کمپیوٹر سنٹر کے منیجر اور ماہنامہ ''بانگ حراء'' کے ایڈیٹر ہیں۔

سعودی عرب میں قیام کے دوران وہ مختلف دینی، علمی، تبلیغی، سماجی خدمات انجام دیتے رہے اور تصنیف وتالیف میں لگے رہے، اس دوران انھوں نے درج ذیل رسالے لکھے:

(۱) کمپیوٹر کیا ہے؟

(۲) روزہ فضائل ومسائل

(۳) اعمال حج

(۴) زکوٰۃ فضائل ومسائل

(۵) مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی، حیات وخدمات، اوصاف وکمالات

(۶) ہندو پاک کے فقہی مکاتب فکر اور اسلامی فرقے

(۷) حج فضائل ومسائل (غیر مطبوعہ)

پیش نظر کتاب میں انھوں نے سعودی عرب کے قیام کے تئیس سالوں کی مختصر سی روئداد بیان کی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے، امید ہے کہ قارئین اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے، اور ایک ہی نشست میں اسے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو خیر کا باعث بنائے۔ (آمین)

سید محمد عبدالعزیز عزیزؔ

۳۱؍مارچ ۲۰۰۷ء

۱۱؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

پیش لفظ

زیر نظر کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے سعودی عرب اور وہاں کے تعلق سے لکھے تھے اور وہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب کی زیر ادارت لکھنؤ سے شائع ہونے والے مشہور ادبی ماہنامہ ''امکان'' اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالہ، ماہنامہ ''بانگ حراء'' کے متعدد شماروں میں شائع ہوئے۔ یہ مضامین پڑھ کر بعض قاریوں، عزیزوں، دوستوں اور چاہنے والوں کا اصرار ہوا کہ سعودی عرب میں گذارے ہوئے ۲۳؍سالوں کی مکمل یادداشت قلمبند کی جائے اور اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے استفادہ کرسکیں، چنانچہ میں نے ان مضامین پر نظر ثانی کی اور بعض مضامین ازسرنو لکھے، اور یہی مضامین اب کتابی شکل میں آپ کے سامنے حاضر ہیں۔

سعودی عرب میں گذارے ہوئے تیئیس سالوں (مئی ۱۹۷۷ء تا اگست ۲۰۰۰ء) کی کہانی تو بڑی لمبی ہے جسے سنانے کے لئے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ آپ کے پاس سننے کی فرصت ہے اس لئے ان روشن یادوں کی روداد مختصر طور پر پیش کردی گئی ہے شاید اس سے کسی کی معلومات میں اضافہ ہوجائے یا کسی کی دلبستگی کا سامان ہوجائے، ورنہ کم سے کم خیالوں ہی میں سہی سعودی عرب کی سیر تو ہو ہی جائے گی۔

اس کتاب سے آپ کو جامعة الامام محمد بن سعود الاسلامية میں گذارے ہوئے چار سالہ تعلیمی دور کے حالات، وہاں کے شب وروز اور عربوں کی تہذیب وثقافت، ان کی خصوصیات، ان کے افکار ونظریات کا علم ہوگا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۷۹ء (یکم محرم الحرام ۱۴۰۰ھ) کا سانحۂ حرم مکی، ۱۹۹۱ء کی جنگِ خلیج، ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت پر سعودی عرب میں موجود تارکین وطن کا ردعمل، اور انہیں ایام میں ریاض میں آل انڈیا ملی کونسل کا قیام، ۲۳؍نومبر ۱۹۹۴ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء پر سی بی آئی کے چھاپہ پر سعودی عرب میں مقیم ہندوستانیوں اور عربوں کا ردعمل اور ریاض میں ''مجلس ابناء ندوہ'' کی تشکیل، اور پھر ان تمام حادثات وسانحات کا پس منظر وپیش منظر، اور ۲۵ سال پہلے کے سعودیہ اور موجودہ سعودیہ کا فرق واضح ہوگا، ماضی قریب اور موجودہ حالات سے واقفیت ہوگی، وہاں کے عوام وخواص میں اس دوران جو اخلاقی واقتصادی زوال آیا ہے اسکی تصویر آپ کے سامنے آئے گی۔

میں جس زمانے میں سعودی عرب پہنچا وہ شاہ خالد کا عہد حکومت تھا، ان کا زمانہ عمومی طور پر سعودی عرب کا ''عہد زریں'' کہلانے کا مستحق ہے، جبکہ شاہ فہد کا عہد سعودی عرب کی ترقی میں جمود اور پھر بتدریج زوال کا عہد ہے، البتہ شاہ فہد کا سب سے بڑا کارنامہ اولاً ''مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف '' مدینہ منورہ اور ثانیاً حرمین شریفین کی حیرت انگیز توسیع وتعمیر اور تزئین ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ملک خالد ۱۹۷۵ء میں شاہ فیصل کی شہادت کے بعد تخت نشین ہوئے اور جولائی ۱۹۸۲ء میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا، ملک فہد ان کے جانشین ہوئے، ملک خالد کا زمانہ سعودی عرب کی ترقی اور عروج کا زمانہ ہے، ان کے بعد سعودی عرب کی ہر طرح کی ترقی جمود وتعطل کا شکار ہوگئی، اور ملک مائل بہ زوال ہوگیا، یہ الگ بات ہے کہ جو تعمیراتی اور عمرانی کام شاہ خالد کے زمانے میں شروع ہو چکے تھے وہ مکمل کئے جاتے رہے، یہ زوال بظاہر نظر نہیں آتا تھا، لیکن ۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج کے بعد سے یہ زوال ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے، اور ہر عقل محسوس کر سکتی ہے۔ سعودی عرب میں امریکی اثر ورسوخ نے وہاں کی اقتصادی، عمرانی اور تہذیبی وثقافتی حالت کو یکسر بدل ڈالا، سعودی عرب کے زوال کے متعدد اسباب وعلل ہیں جس میں سرفہرست ایران-عراق جنگ، روس-افغانستان جنگ، اور جنگ خلیج ہے، جس کا سب سے زیادہ بار سعودی عرب نے اٹھایا، مزید یہ کہ سعودی عرب سمیت تمام خلیجی ممالک پر امریکہ نے سیاسی اور نفسیاتی اعتبار سے اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا۔

شاہ فہد کا ایک طویل علالت کے بعد یکم اگست ۲۰۰۵ء کو انتقال ہوگیا تو شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز تخت سلطنت پر متمکن ہوئے، شاہ عبداللہ دینی مزاج وذہن کے آدمی ہیں، ۱۹۹۵ء کے اواخر میں جب شاہ فہد کی علالت نے سنگینی اختیار کر لی تھی اس وقت لوگ توقع کر رہے تھے کہ اگر یہ بادشاہ بن گئے تو ملک کی پالیسی یقیناً تبدیل ہو جائیگی، اور سعودی عرب میں امریکی اثر ورسوخ بھی کم ہو جائے گا، جو عرب ملکوں کے لئے ایک خطرہ بنا ہوا ہے، مگر شاہ فہد کی حالت سنبھل گئی اور وہ اگست ۲۰۰۵ء تک تخت خلافت پر متمکن رہے، ان کی وفات کے بعد شاہ عبداللہ تخت پر بیٹھے، لیکن اس دوران ملکی حالات خراب سے خراب تر ہو چکے تھے، امریکی اثر ورسوخ صرف سعودیہ ہی میں نہیں بلکہ پوری خلیج میں کافی بڑھ چکا تھا۔ بس اب تو اللہ تعالیٰ سے یہی دعاء ہے کہ وہ تمام اسلامی وعربی ممالک کی غیب سے مدد فرمائے، اور ان کو امریکہ کی دہشت گردی سے محفوظ رکھے، خاص طور سے حرمین شریفین کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

امریکہ کی نگاہ میں سعودی عرب ۱۹۷۳ء ہی میں چڑھ گیا تھا جب شاہ فیصل مرحوم نے اور ان کے ایماء پر دوسرے عرب ملکوں نے پٹرول کو بطور ہتھیار استعمال کیا تھا، اور امریکہ کے اس بیان پر کہ ''ہم تیل کے کنوؤں پر قبضہ کر لیں گے'' انھوں نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا ''ہم چٹائی پر بیٹھیں گے اور کھجور کھائیں گے لیکن پٹرول کے کنوؤں پر قبضہ نہیں کرنے دیں گے۔''

شاہ فیصل کی اس جرأت ایمانی اور غیرت دینی کو امریکہ نے کبھی معاف نہیں کیا اور اس کی قیمت انھیں اپنے خون سے چکانی پڑی، چنانچہ امریکہ نے اسی وقت سعودی عرب کے تیل کے کنوؤں پر سیاسی اعتبار سے قبضہ کرنے کی لانگ ٹرم پلاننگ کر لی۔ ایران-عراق جنگ، پھر روس-افغانستان جنگ اور آخر میں کویت پر عراق کا قبضہ اور اس کے نتیجہ میں امریکی افواج کا سعودی عرب میں داخلہ، یہ سب امریکہ کی لانگ ٹرم پلاننگ کا ہی شاخسانہ ہے۔

صرف سعودی عرب ہی نہیں بلکہ خلیج کے تمام ممالک پر امریکی اثر ورسوخ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اب اس نے ملک کے داخلی معاملات پر بھی مداخلت شروع کر دی ہے، اور ان ممالک کے حکمرانوں کے لبوں پر مہر سکوت لگی ہوئی ہے، اور وہ ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم'' کا مصداق بنے ہوئے ہیں، اور ان کی حالت ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کی ہو کر رہ گئی ہے کہ جائیں تو کدھر جائیں ''آگے دریا ہے اور پیچھے کھائی ہے''۔

امریکہ کی داداگیری کی انتہا یہ ہے کہ یہ عرب ممالک دوسرے ملکوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کی کوئی مدد بھی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اس سے روکا جاتا ہے اور ان کو ''دہشت گردی'' کے فروغ دینے کا مجرم گردانا جاتا ہے۔ چنانچہ ان ملکوں کی مدد سے دوسرے ملکوں میں دین کے جو بہت سے اہم اور ضروری کام انجام پا رہے تھے وہ بھی معرض التواء میں پڑ گئے ہیں، یہی نہیں بلکہ امریکہ کے ۹/۱۱ کے حادثہ میں زیادہ تر سعودی افراد کو ملوث بتایا جا رہا ہے تاکہ بعد میں (خدانخواستہ) سعودی عرب پر مزید شکنجہ کسا جا سکے۔

امریکہ نے جب ایران، افغانستان اور کویت کو کمزور و بے بس کر دیا اور سارے خلیجی ممالک پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور ان ممالک کو اقتصادی وعمرانی اعتبار سے پچاس سال پیچھے ڈھکیل دیا، تو اب اس کو اپنے چہیتے بیٹے ''اسرائیل'' کی حفاظت کی فکر لاحق ہوئی۔

چونکہ ایران کے خلاف ۱۹۷۹ء کی جنگ میں تمام عرب ممالک، خصوصاً کویت اور سعودی عرب نے عراق کی مالی، اخلاقی اور اسلحے سے بھرپور مدد کی تھی اس لئے عراق ایک بڑی قوت بن کر ابھرنے لگا تھا، آٹھ سالہ جنگ کے تجربہ نے اس کو مزید تقویت پہنچائی تھی، امریکہ کا کام جب وہاں کے صدر صدام

حسین سے نکل گیا تو اس نے عراق کو بھی کیمیکل اور جراثیمی ہتھیار کی موجودگی کا مجرم بتا کر مارچ ۲۰۰۳ء میں عراق پر قبضہ کرلیا، صدام حسین کہیں روپوش ہوگئے لیکن بالآخر ۱۳/دسمبر ۲۰۰۳ء کو ایک زیر زمین بنکر سے گرفتار کئے گئے اور عراق کی نام نہاد شیعہ حکومت کے ذریعہ ان کو پھانسی کی سزا دی گئی، اور عین بقرعید کے دن جب لوگ جانوروں کی قربانی کرنے کی تیاری کررہے تھے، ۳۰/دسمبر ۲۰۰۶ء کو انہیں سولی پر لٹکادیا گیا۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ صدر صدام مرحوم کی قربانی ضائع نہیں جائیگی، اور کسی کسی نہ دن امریکہ کے حکمراں کو بھی اللہ تعالیٰ تہ تیغ کرائے گا اور امریکہ کو تباہ وبرباد کرائے گا۔

فی الوقت پوری دنیا کا جو سیاسی منظر نامہ ہے وہ سب کی نگاہوں کے سامنے ہے، پل پل حالات بدل رہے ہیں، کب کیا ہوگا؟ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اب صومال امریکہ کے نشانے پر ہے، ہوائی بمباری شروع ہوچکی ہے، شام کو دھمکیاں دی جارہی ہیں، ایران پر اقتصادی پابندیاں لگ چکی ہیں اور اپریل میں اس پر امریکی حملہ کا بھی خدشہ ہے، اس کے بعد شاید پاکستان اور سعودی عرب کی باری ہو......لیکن ہم مسلمان ہیں، اللہ جو چاہے وہی ہوتا، امریکہ جو چاہے وہ ہونا ضروری نہیں ہے ﴿ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین﴾ (آل عمران آیت ۵۴) ہم اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہیں، یہ کوئی ضروری اور یقینی بات نہیں ہے کہ امریکہ جو کچھ سوچ رہا ہے اور کرنا چاہتا ہے وہ پورا ہی ہوجائے، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے مسلمانوں کی مدد فرمائے، اور امریکہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، ہمارا کام اپنی حد تک کامیابی کے لئے جدوجہد کرنا اور دعاء کرنا ہے، تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اسلامی قالب میں ڈھالیں، گناہوں سے توبہ واستغفار کریں، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ کو ہمارے حال پر رحم آجائے، اور امت مسلمہ ذلت ونکبت کے قعر مذلت سے نکل کر عزت وافتخار سے ہمکنار ہوجائے ؂

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(علامہ اقبالؒ)

محمد عبدالرشید ندوی
ندوی منزل، ندوہ روڈ، لکھنؤ-۲۰
۱۲/ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدینہ منورہ خواب وخیال میں

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

تقریباً ساڑھے چھ سال پہلے کی بات ہے کہ میں تئیس سالہ خود ساختہ جلاوطنی کے بعد پھر اپنے عزیزوں دوستوں محسنوں اور چاہنے والوں کے درمیان واپس آگیا ہوں۔ ان ۲۳/سالوں کی روشن یادوں کو لکھنؤ سے جدہ کی حج فلائٹوں نے اور حجاج کرام کی میری رہائش گاہ کے بالکل نزدیک ندوہ سے روانگی نے مزید اجاگر کردیا ہے اور اب پھر حج وعمرہ کرنے، مسجد نبوی کی زیارت کرنے اور حضور پاک ﷺ پر صلاۃ وسلام پڑھنے کی خواہش دل میں انگڑائیاں لینے لگی ہے۔

یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عالمیت کے پہلے سال (درجہ پنجم عربی) میں زیر تعلیم تھا کہ ہمارے پڑوسی مولانا اقبال احمد ندوی اعظمی مزید تعلیم کیلئے مدینہ یونیورسٹی (مدینہ منورہ) چلے گئے۔ ذہن میں ایک ہلچل سی مچی، لیکن جلد ہی گردش ایام نے اسے تحلیل کردیا، البتہ سعودی عرب جانے کی خواہش وفکر کا بیج اسی وقت ذہن کی کھیتی میں پڑ گیا، جو آگے چل کر ایک تناور درخت بن گیا۔

۱۹۷۰ء کے اوائل میں جب کانپور کے ایک شناسا ڈاکٹر جناب رجب علی مرحوم حج سے واپس آئے تو انہوں نے مدینہ یونیورسٹی جانے کا تذکرہ کیا اور مجھ سے کہا تم بھی وہاں مزید تعلیم کے لئے چلے جاؤ، وہاں دنیا کے تمام ملکوں کے طلباء پڑھنے آتے ہیں، میں نے سوچا کہ ابھی ندوہ سے فراغت میں دو سال باقی ہیں ندوہ سے ''عالمیت'' کرلوں تو پھر دادا مرحوم مولانا سید محمد عبدالحی (سابق جنرل سکریٹری جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور) سے کہوں کہ وہ کوشش کرکے میرا داخلہ مدینہ یونیورسٹی میں کرادیں۔ دادا مرحوم چار بار حج کے لئے سعودی عرب جاچکے تھے اور مدینہ منورہ میں مقیم بعض ہندوستانی تاجروں کے شریک تجارت بھی رہ چکے تھے، مدینہ منورہ میں عبدالغنی دادا نے وہاں کے یتیم بچوں کے لئے جو یتیم خانہ

اور تعلیمی وصنعتی اسکول ''دار الايتام والصنائع الوطنية'' کے نام سے کھولا تھا، اس کا خاکہ بنانے میں بھی شریک رہے تھے اور اس ادارہ کی روداد بنام ''ندائے طیبہ'' اور دیگر لٹریچر کی طباعت واشاعت کے ہندوستان میں ذمہ دار بھی تھے۔ نیز ''مدرسہ فخریہ عثمانیہ'' کے مہتمم جناب سید مشتاق حسین صاحب سے اس وقت بھی ان کے روابط تھے، اور وہ میری موجودگی میں دادا مرحوم سے ملاقات کے لئے ایک بار کانپور بھی آچکے تھے اور سعودی باشندے ہو چکے تھے۔ ویزا وغیرہ نکلوا سکتے تھے، اس لئے میرا خیال تھا کہ میں کسی نہ کسی ذریعہ سے سعودی عرب پہنچ ہی جاؤں گا۔ ندوہ میں ''عالمیت'' کا میرا آخری سال تھا، میں گرمیوں کی تعطیل دادا مرحوم کے پاس کانپور میں گزار کر پہلی جون کو لکھنؤ پہنچا، اور ۸/جون ۱۹۷۱ء کو تین روز کی مختصر علالت کے بعد ان کا اچانک انتقال ہو گیا اور میں ''بسا آرزو کہ خاک شد'' کی مجسم تصویر بن کر رہ گیا۔

دادا کے انتقال کی وجہ سے مجھے سعودی عرب جانے کے سلسلے میں اپنے طریق کار کا از سر نو جائزہ لینا پڑا، اس درمیان کچھ اور طلباء کے بارے میں سنا کہ وہ مدینہ یونیورسٹی چلے گئے تو میری آتش شوق مزید بھڑک اٹھی، چنانچہ میں نے خود ہی عربی میں درخواست لکھی اور اس وقت کے مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ عبداللہ بن عبدالعزیز بن باز مرحوم کو مدینہ منورہ روانہ کردی (جو بعد میں سعودی عرب کے مفتی اعظم اور ''دار الافتاء والبحوث العلمية'' کے ڈائریکٹر ہوئے) ان کا جواب آیا کہ آپ تعلیمی سال کے شروع میں اپنی درخواست روانہ کریں۔

اواخر ۱۹۷۱ء میں ندوہ سے عالمیت پاس کرنے کے بعد ''دورۂ حدیث'' کے لئے دارالعلوم دیوبند جانے کا خیال تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر نہ جا سکا تو ندوہ ہی میں ''فضیلت'' میں داخلہ لے لیا لیکن اپنی درخواست برابر مدینہ یونیورسٹی بھیجتا رہا، کبھی جواب آتا کہ اب گنجائش نہیں ہے، کبھی جواب آتا کہ سعودی سفارتخانے سے رابطہ کریں، سفارتخانے کو خط لکھتا تو کبھی وہ جواب دیتے کہ ہمیں مدینہ یونیورسٹی سے کوئی ہدایت نہیں ملی ہے، کبھی لکھتے کہ ہندوستان کی ''وزارت تعلیم وسماجی بہبود'' دہلی سے رابطہ کرو۔

جولائی ۱۹۷۳ء میں ''فضیلت'' کے ہم تین طلبا، ڈاکٹر عطاء الرحمان ندوی، ڈاکٹر نفیس الرحمٰن خاں ندوی بھوپالی اور راقم سطور نے ''دارالحدیث الحسنية'' مغرب (مراکش) داخلہ کے لئے درخواست روانہ کی، وہاں سے مدیر مصطفی بن احمد علوی کا لکھا ہوا منظوری کا خط مورخہ ۲۵/جولائی ۱۹۷۳ء نمبر

رباط (مراکش) کے منظوری کے خط کی فوٹو کاپی

Last\23sal 001.jpg not found.

۲۱۳/۳/۷ہم لوگوں کو وصول ہوا، جس میں تحریر تھا کہ آپ اپنے خرچ پر مراکش آئیں، یہاں آکر ٹسٹ ہوگا اور آپ کی صلاحیت کے مطابق کسی درجہ میں داخلہ ہوگا، اخراجات کے لئے ماہانہ ۳۰۰/درہم دیئے جائیں گے، مراکش تک کرائے کے لئے روپئے کا بندوبست کرنا میرے لئے ایک اہم مسئلہ تھا، اس کے علاوہ دوسری فکر یہ تھی کہ کیا ۳۰۰/درہم مراکش میں اخراجات کے لئے کافی ہوں گے؟ اتفاق سے انہیں دنوں ایک ندوی فاضل جو کسی عرب ملک میں مقیم تھے ندوہ آئے، ان سے میں نے معلوم کیا کہ کیا ۳۰۰/درہم مراکش میں اخراجات کے لئے کافی ہوں گے؟ انہوں نے جواب دیا کافی نہ ہوں گے، ان کے اس جواب نے مراکش جانے کا معاملہ بالکل ہی ختم کردیا۔

۱۹۷۳ء میں جب میں فضیلت کر چکا تھا تو معلوم ہوا کہ ہندوستانی حکومت نے سعودی حکومت سے مدینہ یونیورسٹی میں ڈائریکٹ طلباء کو لئے جانے پر اعتراض کیا ہے، اور نئے داخلے "وزارت تعلیم وسماجی بہبود" کے ذریعہ ہی ہوں گے، میں نے ایک درخواست وہاں بھی روانہ کردی، انھوں نے مجھے ایک فارم بھیجا کہ اسے آپ پُر کر کے روانہ کردیں، میں نے وہ فارم پُر کر کے ان کو روانہ کردیا۔

ایک روز مغرب یا عشاء کی نماز کے بعد ماسٹر محمد سمیع صدیقی مرحوم (سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) سے معلوم ہوا کہ ارشاد احمد اعظمی (متعلم درجہ تخصص عربی) کے پاس ضیاء الرحمان انصاریؒ (سابق ممبر آف پارلیمنٹ ووزیر جنگلات وماحولیات) کی طرف سے مبارکباد کا خط آیا ہے کہ آپ کے کاغذات سفارش کے بعد آگے بڑھادیئے گئے ہیں، مزید کاروائی کے لئے انتظار کریں۔ ضیاء الرحمان انصاری چونکہ اناؤ کے تھے، اور میرے پھوپھا سید مسعود اختر زیدی (اکاؤنٹنٹ ایگرو کمپنی یوپی اسٹیٹ لکھنؤ) کے ان سے اچھے تعلقات تھے، اس لئے پھوپھا کے ذریعہ "وزارت تعلیم وسماجی بہبود" میں ان سے سفارش کرانے کے لئے اناؤ کے ڈاک بنگلہ میں ملا، انہوں نے اپنے سکریٹری کو میرے بارے میں کچھ ہدایات اپنی ڈائری میں نوٹ کرادیں، اور میں مطمئن ہوکر لکھنؤ واپس چلا آیا۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ وزارت تعلیم کے اسکالر شپ ڈپارٹمنٹ نے ارشاد احمد کو اور کچھ دوسرے اداروں کے لڑکوں کو انٹرویو کے لئے دہلی بلایا ہے، میں بھی منتظر تھا لیکن میرے پاس کوئی اطلاع نہ آئی۔ ارشاد احمد اعظمی اور دیگر چند طلباء کا انٹرویو میں انتخاب ہوگیا اور وہ مدینہ یونیورسٹی چلے گئے۔ حکومت ہند کی وساطت سے مدینہ یونیورسٹی جانے والے طلباء کا یہ پہلا اور آخری گروپ تھا اس کے بعد پھر دوبارہ براہ راست مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ شروع ہوگیا۔

کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ حکومت ہند نے ملک سے باہر جانے پر مکمل پابندی لگادی ہے اور کوئی شخص پاسپورٹ اور P.Form حاصل کرنے کے باوجود وزارت خارجہ سے .N.O.C (اجازت نامہ) حاصل کئے بغیر ملک سے باہر نہیں جاسکتا، میرے لئے یہ ایک نئی افتاد تھی کہ اگر براہ راست مدینہ یونیورسٹی سے منظوری آ بھی گئی، تو حکومت ہند سے .N.O.C کیسے لوں گا ؟

ہندوستانی حکومت سے اجازت نامہ لینے کی شرط کے بعد معلوم ہوا کہ میرے ندوہ کے ہم درس خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی (ایڈیٹر الفرقان، لکھنؤ) مدینہ یونیورسٹی چلے گئے؟ کس کی سفارش سے گئے؟ .N.O.C کیسے حاصل کیا کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ اسی دوران حکیم افہام اللہ مرحوم کے صاحبزادے حکیم کلیم اللہ صاحب علی گڑھ سے لکھنؤ آئے، تو ایک روز ان سے اچانک ندوہ کے "کتب خانہ" میں ملاقات ہوگئی، انھوں نے اپنے بعض عزیزوں اور مولانا منظور نعمانی صاحب سے ملاقات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، اور میری رفاقت کے طالب ہوئے، تو میں فوراً تیار ہوگیا، حکیم افہام اللہ مرحوم کے دادا داروغہ بسم اللہؒ کافی عرصہ میرے آبائی وطن قصبہ" کوڑا جہان آباد" ضلع فتحپور میں رہ چکے تھے اس لئے میرے دادا اور والد صاحب سے ان کے قدیمی تعلقات تھے، میں جب ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں "ہائی اسکول" کا امتحان دینے علی گڑھ گیا تھا، تو دادا کا خط حکیم افہام اللہ صاحب کے نام لے کر گیا تھا، اور ان ہی کے گھر "انہونہ ہاؤس" میں میرا قیام رہا تھا، وہیں حکیم کلیم اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، جب ہم مولانا منظور نعمانی صاحب کے پاس پہنچے تو یکایک مجھے خیال آیا کہ مولانا سے دریافت کروں کہ خلیل الرحمٰن سجاد نے سعودی عرب (مدینہ یونیورسٹی) جانے کیلئے .N.O.C کیسے اور کہاں سے حاصل کیا تھا۔ جب میں نے مولانا سے دریافت کیا تو مولانا نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، ان کے اس جواب پر مجھے بڑا تعجب ہوا لیکن میں خاموش رہا۔ چونکہ میری خط وکتابت وزارت تعلیم دہلی سے جاری تھی اس لئے میں نے وہاں سے .N.O.C کے بارے میں معلومات چاہیں تو ان کا جواب آیا کہ جب آپ کا وظیفہ منظور ہوجائے تو وزارت کو لکھیں پھر اس پر غور کیا جائے گا۔

مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ بن باز کی طرف سے موصول ہونے والے عربی خطوط میں سے جو چھ خط میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱)۔ ۷/۱/ ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۲.اگست ۱۹۷۱ء شیخ بن باز کی طرف سے ہے، جس میں ہندوستانی حکومت

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی کے ایک خط کی فوٹو کاپی

Last\23sal 002.jpg not found.

طرف رجوع کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔رجسٹری نمبر ۹۹۷

(۲) ۲۴/۲/۱۳۹۲ھ مطابق ۱۲/اگست ۱۹۷۲ء شیخ بن باز کی طرف سے ہے، اصل سند یا سعودی سفارتخانے سے مصدقہ سند اور کیرکٹر سٹیفکیٹ اور برتھ سٹیفکیٹ، اور ہیلتھ سٹیفکیٹ بھیجنے کی ہدایت کی گئی ہے۔رجسٹری نمبر ۹۸۵

(۳) ۱۲/۷/۱۳۹۲ھ ۲۸ اگست ۱۹۷۲ء شیخ بن باز کی طرف سے ہے، ماہ محرم میں درخواست بھیجنے کی ہدایت کی گئی ہے۔رجسٹری ۱۵۰

(۴) ۲۱/۲/۱۳ھ مطابق ۵/۵/۱۹۷۳ء شیخ بن باز کی طرف سے ہے، مگر دستخط محمد عمر فلاتہ کے ہیں۔ درخواست سعودی سفارتخانے بھیجنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

(۵) ۲۲/۵/۱۳۹۳ھ مطابق ۲۵/۶/۱۹۷۳ء شیخ بن باز کی طرف سے ہے، مگر دستخط سلمان الحازمی کے ہیں۔درخواست سعودی سفارتخانے بھیجنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

(۶) ۴/۱/۱۳۹۴ھ مطابق ../../۱۹۷۴ھ شیخ بن باز کی طرف سے ہے، درخواست سعودی سفارتخانے بھیجنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

سعودی سفارتخانے کے صرف تین خط میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں جنکی تفصیل یہ ہے۔

(۱) ۲۸/۴/۱۳۹۳ھ یہ خط عربی میں ہے اور اس وقت کے سعودی سفیر انس یوسف یاسین کے دستخط ہیں جنھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ''مدرسہ ثانویہ'' کا سنگ بنیاد رکھا تھا، اس میں حکومت ہند سے رجوع کرنے کیلئے لکھا گیا ہے۔

(۲) ۳/ستمبر ۱۹۷۳ء یہ خط انگریزی میں سکریٹری کے دستخط سے جاری ہوا ہے، جس میں ہندوستانی وزارت خارجہ سے رجوع کرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔

(۳) ۲۷/مئی ۱۹۷۴ء یہ خط بھی انگریزی میں ہے اور سکریٹری کے دستخط سے جاری ہوا ہے، اس میں ہندوستانی وزارت تعلیم وسماجی بہبود سے رجوع کرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔

وزارت تعلیم اور سماجی بہبود دہلی سے میری جو خط وکتابت ہوئی ان میں سے ۵ خط میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں جو درج ذیل تاریخوں میں لکھے گئے:

(۱) ۱۲/اپریل ۱۹۷۲ء مدینہ یونیورسٹی کے لئے حکومت ہند کے اسکالرشپ سے متعلق ہے۔دستخط

وزارت تعلیم وسماجی بہبود کے ایک خط کی فوٹو کاپی

Last\23sal 5.jpg not found.

سعودی سفیر انس یوسف یاسین مرحوم کے ایک خط کی فوٹو کاپی

Last\23sal 1.jpg not found.

پی۔پی۔سود، سکشن آفیسر کے ہیں۔

(۲) ۵ جولائی ۱۹۷۲ء N.O.C. سے متعلق ہے۔ دستخط ایل۔سی۔ گپتا کے ہیں۔

(۳) ۲۷/ جولائی ۱۹۷۳ء مدینہ یونیورسٹی کے لئے حکومت ہند کے اسکالرشب سے متعلق ہے۔ دستخط پی۔پی سود، سکشن آفیسر کے ہیں۔

(۴) ۱۸/ستمبر ۱۹۷۳ء دستخط اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر D. V. NAVATHE کے ہیں جس میں ۳۰ ستمبر تک منسلکہ فارم بھر کر بھیجنے کی ہدایت ہے۔

(۵) ۱۶/فروری ۱۹۷۴ء میں یہ اطلاع ہے کہ مدینہ یونیورسٹی کے لئے آپ کا سلیکشن ممکن نہیں۔ دستخط پی۔پی سود، سیکشن آفیسر کے ہیں۔

چونکہ مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کی کوشش میں نے ۱۹۷۱ء ہی سے شروع کردی تھی اس لئے یہ فکر بھی پیدا ہوگئی تھی کہ کسی طرح مدینہ منورہ سے داخلہ کی منظوری آنے سے پہلے ہی پاسپورٹ بھی بنوا کر رکھ لیا جائے تاکہ منظوری آنے کے بعد پھر کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، کیونکہ مبارک حسین ندوی نیپالی جو میرے کلاس فیلو تھے، اور اب نیپال کے ایک مدرسہ کے بانی و مہتمم ہیں، ان کا قصہ بھی میرے ذہن میں تازہ تھا کہ انھوں نے مدینہ یونیورسٹی سے منظوری آنے کے بعد جب پاسپورٹ کیلئے درخواست دی تو حکومت نیپال نے پاسپورٹ دینے سے انکار کردیا، آخر وہ خود کٹھمنڈو گئے، دو ہفتے تک بھاگ دوڑ کرتے رہے، مختلف ذرائع اور متعدد سفارشوں کا سہارا لیا لیکن حکومت نیپال نے ان کو پاسپورٹ نہیں دیا اس لئے وہ مدینہ یونیورسٹی نہیں جاسکے۔

ہندوستان میں پاسپورٹ بنوانا آج جتنا آسان ہے اتنا پہلے کبھی نہ تھا، جنتا حکومت کے آنے (۱۹۷۷ء) سے پہلے کانگریس کے دور میں پاسپورٹ بنوانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ پاسپورٹ ہونے کے باوجود حکومت ہند سے ملک سے باہر جانے کی اجازت بھی لینی پڑتی تھی وہ الگ ایک مرحلہ تھا۔ اس کے علاوہ P. FORM بھر کر ریزرو بینک سے اجازت لینی پڑتی تھی اور یہ بتانا پڑتا تھا کہ ٹکٹ اور بیرون ملک میں اخراجات کیلئے رقم کا انتظام کہاں سے کیا گیا ہے، پھر اجازت کا ملنا بھی یقینی نہیں ہوتا تھا، پاسپورٹ بنوانے کیلئے فارم پر فرسٹ کلاس مجسٹریٹ یا فرسٹ سکریٹری یا اس کے برابر کے عہدہ کے کسی آفیسر کے دستخط ہونا ضروری تھا، اور یہاں نہ تو کوئی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ

یا سکریٹری ہی جاننے والا تھا اور نہ کوئی زمین جائیداد میرے پاس یا والد صاحب کے پاس تھی جو ضمانت کے طور پر لکھائی جاتی، اس لئے پاسپورٹ کا بننا بھی مجھے مشکل لگ رہا تھا، اس کے باوجود میں نے بڑی بھاگ دوڑ کی لیکن کسی سے پاسپورٹ فارم پر تصدیق کرانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

ایک روز بعد نماز عصر ظفر احمد صدیقی ندوی (پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو اس وقت ندوہ میں زیر تعلیم تھے) سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ میں نے اپنا پاسپورٹ بنوالیا ہے، میرے یہ سوال کرنے پر کہ پاسپورٹ فارم کس سے اٹسٹ کرایا تھا، انھوں نے بتایا کہ شمس الرحمان فاروقی صاحب (مشہور ادیب ونقاد، اس وقت کانپور G.P.O. میں ڈائرکٹر پوسٹل سروسز تھے) سے اٹسٹ کرایا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا فارم بھی اٹسٹ کروادیں، چنانچہ ۹/اپریل ۱۹۷۴ء کو جب شمس الرحمان فاروقی لکھنؤ آئے تو وہ گئے اور میرا فارم اٹسٹ کرالائے اور میں نے ۱۲/ اپریل کو اپنا فارم پاسپورٹ آفس میں جمع کردیا، ۱۶/اپریل کو پولیس انکوائری بھی ہوگئی، لیکن شاید دو تین روز بعد مجھے پاسپورٹ آفس سے ایک خط موصول ہوا کہ کوئی ایسا ڈاکومنٹ جمع کریں جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ آپ کا داخلہ مدینہ یونیورسٹی میں ہوگیا ہے، میں نے مدینہ یونیورسٹی سے آئے ہوئے خط مورخہ ۴/۱/۱۳۹۴ھ (فروری ۱۹۷۴ء) جس میں مجھے اپنے کاغذات سعودی سفارت خانہ بھیجنے کی ہدایت کی گئی تھی، کا انگریزی ترجمہ تصدیق کراکے بھیج دیا، چنانچہ ۲۶/اپریل ۱۹۷۴ء کو میرا پاسپورٹ بن گیا، اور شاید دو تین روز میں مجھے رجسٹرڈ ڈاک سے وصول ہوگیا۔

۱۹۷۴ء میں ایک روز میں نے جمعیت علماء، ہند کے عربی ہفت روزہ الکفاح دہلی میں یہ خبر پڑھی کہ رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ نے بھی مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم کے لئے کچھ وظائف دینے شروع کردیئے ہیں، چنانچہ میں نے بھی ایک درخواست مع ضروری کاغذات کے اس وقت کے جنرل سکریٹری محمد صالح القزاز کو ارسال کردی انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے میرے بارے میں تصدیق چاہی، جس دن یہ خط ندوہ پہنچا اسی روز مولانا رحمۃ اللہ علیہ رابطہ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے سعودی عرب تشریف لے جاچکے تھے، مولانا نے رابطہ والوں کو میرے بارے میں کیا جواب دیا، مجھے نہیں معلوم البتہ سعودی عرب سے واپسی پر جب میں مولانا سے ندوہ کے مہمان خانہ میں ملا تو مولانا مرحوم نے فرمایا: کیا تم نے رابطہ کو مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم کے لئے اسکالرشپ

عالم اسلامی، مکہ مکرمہ کے ایک خط کی فوٹو کاپی

Last\23sal 3.jpg not found.

کی درخواست بھیجی تھی؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو مولانا نے فرمایا اگر تم کو مدینہ یونیورسٹی جانا تھا تو مجھ سے کہتے میں تم کو بھیج دیتا تم نے وہاں خط کیوں بھیجا۔ رابطہ سے کوئی جواب آئے تو مجھے دکھانا، اتفاق سے دوسرے ہی روز رابطہ کی رجسٹری مجھے وصول ہوگئی، جس میں لکھا تھا کہ آپ اپنے کاغذات مدینہ یونیورسٹی بھیج دیں۔ وہ خط میں نے مولانا کو دکھایا، مولانا نے بھی وہی بات کہی جو رابطہ کے خط میں رابطہ لکھی تھی، اور مدینہ یونیورسٹی تو میں کاغذات ۱۹۷۱ء سے مسلسل بھیج ہی رہا تھا اس لئے میں نے مولانا سے ایک سفارشی خط لکھنے کو کہا، مولانا نے خط لکھنے سے معذرت کی، بات آئی گئی ہوگئی، اس کے بعد میں نے یہ طے کرلیا کہ اب سعودی عرب پڑھنے نہیں بلکہ لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد انشاءاللہ وہاں پڑھانے جاؤں گا۔ اسی دوران نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوہ کا پچاسی سالہ عالمی جشن تعلیمی منعقد ہوا، اس میں پورے ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک کی یونیورسٹیوں کے تقریباً ۷۰ نمائندے بھی شریک ہوئے، انہیں میں جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض کے وائس چانسلر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی بھی شامل تھے، انہوں نے جشن کے اختتام پر جامعۃ الامام میں ندوہ کے تین طلبہ کو تعلیمی وظائف دینے اور ایم-اے میں داخلہ دینے کا اعلان کیا۔

۱۹۷۳ء میں ندوہ سے فضیلت پاس کرنے کے بعد میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں اورینٹل ڈیپارٹمنٹ کے ''فاضل ادب'' میں داخلہ لے لیا، اور ۱۹۷۴ء میں فرسٹ ڈویژن سے ''فاضل ادب'' کا امتحان پاس کیا، ۱۹۷۵ء میں بی-اے میں داخلہ لے لیا، بی-اے کے پہلے سال میں تھا کہ معہد دارالعلوم میں ایک استاد کی جگہ خالی ہوئی تو والد مرحوم نے مولانا محبّ اللہ لاری ندوی مرحوم (سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے مشورہ سے میری درخواست بھی دلوادی اور وہ منظور بھی ہوگئی، اس طرح میں معہد میں استاد بھی ہوگیا اور میری تعلیم بھی جاری رہی۔

۱۹۷۶ء میں میں نے بی-اے فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا، میرٹ لسٹ میں میرا نام آیا، اور حکومت یوپی کی طرف سے ''نیشنل ایوارڈ'' National Award کا مستحق ٹھہرا، جو ماہانہ ایک سو روپیہ تھا۔

اور پھر اچانک جنوری ۱۹۷۷ء میں جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم-اے فرسٹ ائیر کے امتحانات دے رہا تھا اور ندوہ میں بحیثیت مدرس بھی خدمات انجام دے رہا تھا، ایک روز صبح صبح ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی صاحب نے مجھے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی ریاض میں مزید تعلیم کیلئے منتخب کئے جانے پر مبارکباد پیش کی، میں یہ خبر سن کر حیران رہ گیا، کیونکہ اس دوران میں

نیشنل ایوارڈ کے اطلاعی خط کی فوٹو کاپی

Last\23sal 4.jpg not found.

نے داخلہ کے لئے اپنے کاغذات کہیں بھی نہیں بھیجے تھے،اور نہ دارالعلوم کے ذمہ داروں کو اپنے کاغذات دیئے تھے،البتہ استاذ گرامی مولانا محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء،لکھنؤ) سے ایک دو بار سرسری طور پر تذکرہ کیا تھا، یہ نئی خبر میرے لئے خوش کن بھی تھی اور حیران کن بھی، کہ بیٹھے بٹھائے بغیر کسی کوشش کے میرا نام آخر کیسے آ گیا؟ ساتھ ہی تکلیف دہ بھی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں دوبارہ آرزوؤں کے بازار سجاؤں، تمناؤں کے شیش محل تعمیر کروں، مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ کو خوابوں میں بساؤں اور نتیجہ وہی صفر نکلے، کیونکہ پرانی یادوں کو تازہ کرنا ایک ہی وقت میں خوش کن بھی ہے اور تکلیف دہ بھی ؎

گر خواہی تازہ داشتن داغہائے سینہ را
گاہے گاہے بازخواں ایں قصہ پارینہ را

میں ابھی دریائے حیرت میں غلطاں و پیچاں تھا کہ استاذ گرامی مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے مجھے بلا کر اس خبر کی تصدیق کر دی اور جلد سے جلد ضروری کاغذات تیار کرانے کی بھی تاکید کی اور ایک بار پھر دل کی پرانی خواہشیں دل کے نہاں خانہ میں انگڑائیاں لینے لگیں اور بقول فراق ؎

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جامعۃ الامام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے اعلان کی بموجب اواخر ۱۹۷۶ء میں مولانا علی میاں ندویؒ نے جامعۃ الامام کے وائس چانسلر کو تین طلبہ کے نام داخلہ کی منظوری کے لئے بھیجے اور چوتھا نام میرا بھی بڑھا دیا کہ اگر گنجائش ہو تو ان کو بھی لے لیا جائے، لیکن مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا، اللہ تعالی کا فضل وکرم یہ ہوا کہ وائس چانسلر نے چاروں افراد کے نام منظور کر لئے، اور اوائل ۱۹۷۷ء میں چاروں ناموں کی منظوری کا اطلاعی خط ندوہ بھیج دیا۔

ریاض سے داخلہ کی منظوری کے ساتھ ساتھ ہم چاروں (سلمان الحسینی ندوی، شفیق اعظمی ندوی، نظام الدین رانچوی ندوی اور راقم سطور) کے ضروری کاغذات بھی طلب کئے گئے تھے، یہ کاغذات تیار کر کے ریاض روانہ کر دیئے گئے، دو تین ماہ کے بعد وہاں سے خط آیا کہ طلبہ کے کاغذات دوبارہ روانہ کئے جائیں، پہلے والے کاغذات ادھر اُدھر ہو گئے ہیں، چنانچہ تمام کاغذات تیار کر کے دوبارہ بھیجے گئے پھر بھی ریاض سے ویزا اور ٹکٹ آنے میں کافی عرصہ لگ گیا، اسی دوران مولانا علی میاںؒ ندوی کا ریاض جانا ہوا تو جامعۃ الامام کے ذمہ داروں سے بھی ملاقات ہوئی اور ہم لوگوں کے ویزے اور ٹکٹ کی

بات آئی، ٹکٹ اور ویزے کے اجراء کے سلسلہ میں سلیم الرحمٰن خاں بھوپالی ندوی اور جناب طارق حسن عسکری صاحب نے بھی کافی بھاگ دوڑ کی بالآخر ہم چاروں کا ویزا ریاض سے دہلی روانہ کر دیا گیا اور چاروں کے ٹکٹ مولانا علی میاں ندویؒ کے سپرد کر دیئے گئے، مولانا کی واپسی کے بعد ندوہ کے مہمان خانہ میں مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ نے میرا ٹکٹ میرے حوالہ کر دیا۔

پھر تمام ضروری کارروائی کے بعد ہم چاروں کی ۲۷/اپریل کو لکھنؤ سے دہلی اور ۲۸/اپریل کی صبح دہلی سے بمبئی کے لئے انڈین ائرلائن کے جہاز میں سیٹ بھی OK ہوگئی اور بمبئی سے ریاض کی سیٹ OK کرنے کا پیغام Massage بھی بمبئی بھیج دیا گیا، کیونکہ آج سے ۳۰/سال قبل ٹیلیکس، فیکس، اور کمپیوٹر کی سہولتیں موجود نہیں تھیں اس لئے جواب آنے میں کئی روز لگ جاتے تھے۔

میں چونکہ معہد دارالعلوم میں استاد تھا اس لئے وہاں کے ہیڈ ماسٹر ہارون رشید صاحب نے الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا، سب ہی کو میرے ریاض جانے کی خوشی تھی، سب نے ہی مجھے مبارکباد پیش کی، ہارون رشید صاحب نے میرے ریاض جانے کی مناسبت سے ایک الوداعیہ نظم بھی پیش کی:

الوداعیہ

ہو مبارک مولوی عبدالرشید
آپ نے جنت کی پائی اب کلید
اب مدینہ پاک ہے اتنا قریب
جانا پیدل ہے نہیں ہرگز عجیب
سامنے محبوب کا دربار ہے
قربت فاروق یار غار ہے
جب بھی روضہ پر کریں جاکر سلام
ہم صفیروں کا بھی پہونچائیں سلام
یوں کہیں، ہیں ہند میں تیرے غلام
اور تو کچھ بھیجا نہیں لیکن سلام
یا نبی پاک تم کو السلام

صاحب لولاک تم کو السلام
جب کوئی طیبہ کی جانب جاتا ہے
دل کو یاد طیبہ سے تڑپاتا ہے
ہوتا ہوں مسرور اس کے جانے سے
اور بہت مغموم خود رہ جانے سے
ہے یہ میری، یاد رکھیو التجا
ساتھی سب پہنچیں وہاں کیجیو دعاء
جو بھی کوتا ہی ہوئی ہم سے یہاں
یاد ہرگز اس کو نہ کیجیو وہاں
ہے بھلانا بے وفاؤں کا شعار
آپ کے اخلاق کو ننگ وعار
بھولنا مت جاکر وہاں اے عبدالرشید
ورنہ تڑپے گا یہاں ہارونؔ رشید

اور آخر میں مجھ سے اپنے احساسات اور تاثرات بیان کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی، یہ نظم سننے کے بعد پہلی مرتبہ مجھے بڑی شدت سے ندوہ اور گھر چھوٹنے کا احساس ہوا، اور دل سے خوشی کے سارے جذبات یکسر معدوم ہوگئے اور دل رنج وغم سے بھر گیا، میں نے کچھ کہنا شروع کیا لیکن آواز گلوگیر ہوگئی، اور میں نے بات مختصر کر کے گفتگو ختم کر دی۔

ہارون رشید صاحب نے اپنی اس نظم میں مجھ سے تمام ساتھیوں کے لئے ارض حجاز پہنچنے کی دعاء کرنے کی التجا کی تھی، معلوم نہیں کس کی دعاء ان کے کام آ گئی اور وہ خود بھی ایک سال بعد اوائل دسمبر ۱۹۷۸ء میں تعلیم کے لئے ریاض پہنچ گئے۔ ان کا داخلہ ''جامعۃ الریاض'' (موجودہ جامعۃ الملک سعود) کے ''معهد اللغة العربية'' میں ہوا تھا۔ ندوہ سے وہ والد صاحب کا خط اور کچھ سامان لے کر آئے تھے۔

میری روانگی کا دن جیسے جیسے قریب آتا جارہا تھا ویسے ویسے میرے دل کے اندر دو متضاد کیفیتیں ابھرتی جارہی تھیں، ایک کیفیت خوشی ومسرت کی تھی، دوسری کیفیت رنج وغم کی تھی، ایک طرف اگر خوشی میں

پھولا نہیں سمار ہا تھا تو دوسری طرف وفورِ رنج وغم سے آنکھوں کے آنسو خشک ہوگئے تھے، نہ ہنستے ہی بنتا تھا اور نہ روتے ہی بنتا تھا، اپنے گھر، اپنے وطن اپنے شہر اپنے ملک کے چھوٹنے سے زیادہ ندوہ کے چھوٹنے کا غم تھا، جو میرے لیے گھر بھی تھا وطن بھی، شہر بھی تھا ملک بھی، کیونکہ اس کی چہار دیواری کے اندر میں نے پرورش پائی تھی، اسی کی سرزمین میں پلا بڑھا تھا، اسی کے احاطہ کے اندر میں نے بچپن کے سہانے ایام اور بے فکری کے دن گزارے تھے، یہیں کے صاف ستھرے اور دینی ماحول میں میں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تھیں، یہیں سے مجھ کو علم وادب کی بیش بہا دولت ملی، ایسی جگہ کو، ایسی سرزمین کو چھوڑنا جس میں میں نے اپنی زندگی کے کم وبیش بیس سال گزارے تھے، میرے لیے آسان بات نہ تھی۔ مگر حالات اور وقت کا تقاضہ تھا کہ میں جذبات کے بجائے عقل ہی کو اپنا رہنما بناؤں اور اس کے فیصلہ پر عمل کروں۔

میں چونکہ بی اے میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوا تھا اور میرٹ لسٹ میں بھی میرا نام تھا اس لئے لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے مجھے نیشنل ایوارڈ (ماہنامہ سو روپیہ) ملا تھا اور ایوارڈ کی رقم اب تک نہیں مل سکی تھی، حسن اتفاق سے وہ رقم اس موقع پر یک مشت مل گئی جس سے ریاض جانے کی تیاری میں کافی سہولت ہوگئی۔

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

ندوہ سے میرا تعلق اور لگاؤ عقلی سے زیادہ جذباتی تھا، اور جذبات کی حکمرانی میں عقل کا گذر مشکل ہی سے ہوتا ہے، اس لئے بالآخر جذبات کو ٹھنڈا اور عقل کو آگے بڑھانا ہی پڑا، سفر کا دن اور پھر سفر کا وقت آ ہی گیا، اور میں اساتذہ کرام کے جلو میں ندوہ کی کار میں بیٹھ کر اموسی ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ جہاز آ چکا تھا نظر اٹھائی تو عزیزوں دوستوں اور اساتذہ کرام کا ایک ہجوم نظر آیا جو دوپہر کی سخت دھوپ میں ہم لوگوں کو الوداع کہنے کے لئے اور اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کرنے کے لئے اتنی دور آیا تھا، جہاز چھوٹنے کا وقت قریب آ گیا اور ہم لوگ والدین کی شفقت، عزیزوں کی محبت، دوستوں کے خلوص، اور اساتذہ کرام کی دعاؤں کے ساتھ جہاز کی طرف چل دیئے، دونوں طرف سے ہاتھ کے اشاروں سے رخصتی پیام دیئے گئے یہانتک کہ ہم لوگ جہاز Boeing 737 میں سوار ہوگئے، اور جہاز ہم لوگوں کو لے کر رن وے Run Way پر دوڑنے لگا اور پھر اس نے زمین چھوڑ دی، جہاز میں سفر کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بڑی آرزو اور تمنا کے بعد میسر آیا تھا اس لئے جہاز میں بیٹھنے کی خوشی ہونی چاہئے تھی لیکن یہاں دل ہی پہلو میں کب تھا کہ خوش ہوتا، وہ تو دور کہیں پیچھے ان ہی لوگوں کے پاس رہ گیا تھا جو ہمیں رخصت کرنے لئے آئے تھے، اور ابھی تک ائرپورٹ پر کھڑے ہمارے پرواز کرتے ہوئے جہاز کی گردِ راہ کو تک رہے تھے۔

۲۷/اپریل ۱۹۷۷ء کو چار بجے شام ہم لوگ اموسی ائرپورٹ سے روانہ ہوئے، اور ابھی ہم لوگ جہاز میں چائے پی کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ پائلٹ نے سیٹ بیلٹ باندھنے اور چند منٹوں کے بعد دہلی پالم ائرپورٹ پر جہاز اترنے کی اطلاع دی۔ لکھنؤ سے دہلی تک ہوائی سفر صرف ۴۰ منٹ کا تھا۔

جہاز سے اتر کر ٹیکسی کے ذریعہ ہم لوگ مولانا ابوبکر حسنی ندویؒ کی قیام گاہ پر آئے، مولانا ہم لوگوں کے آنے سے بہت خوش ہوئے اور بڑی شفقت ومحبت سے پیش آئے۔ رات وہیں قیام رہا اور صبح ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر ہم لوگ پھر پالم ائرپورٹ پہنچے اور ضروری کارروائی کے بعد ائربس Air Bus سے دس بج کر پچیس منٹ پر بمبئی کیلئے روانہ ہوگئے۔ جہاز ٹھیک ایک گھنٹہ ۴۰ منٹ کے بعد بمبئی کے سانتا کروز ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ ائرپورٹ سے ٹیکسی کے ذریعہ ہم لوگ سلمان حسینی ندوی کے ایک عزیز حافظ مرغوب صاحب کے پاس ''نور باغ'' مسجد پہنچے، حافظ صاحب بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور ہم لوگوں کی بڑی خاطر تواضع کی۔

بمبئی سے ریاض کی سیٹ کی کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی اس لئے ریزوریشن کرانے کی غرض سے ہم لوگ نریمن پوائنٹ سعودی ایئر لائنس کے آفس کے لئے روانہ ہوگئے، ہم لوگ جب بلڈنگ کی لفٹ میں سوار ہوئے تو سوٹیڈ بوٹیڈ ایک صاحب مل گئے، انھوں نے علیک سلیک کے بعد ہم لوگوں کے اس بلڈنگ میں آنے کی وجہ دریافت کی، چونکہ مولوی لوگ تھے جھوٹ بول نہیں سکتے تھے اس لئے اصل غرض وغایت ان کے گوش گذار کردی، انھوں نے کہا کہ آپ لوگ اپنے پاسپورٹ اور ٹکٹ ہمیں دے دیں ہم آپ کی سیٹ کنفرم کرادیں گے، ہم لوگوں نے چونکہ بمبئی میں فراڈ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اس لئے میں نے ان کو جواب دیا کہ ہم آپ کو نہیں جانتے اس لئے پاسپورٹ اور ٹکٹ آپ کے حوالے نہیں کرسکتے، انھوں نے کہا آپ کی مرضی اور چلے گئے۔ ہم لوگ سعودیہ کے آفس پہنچے تو کلرک نے جواب دیا کہ فی الحال کئی روز تک جہاز میں کوئی گنجائش نہیں ہے، وہاں سے ہم لوگ مرغوب صاحب کے پاس نور باغ مسجد واپس پہونچے، وہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد عبداللہ علاء الدین ندوی کے پاس صلاح ومشورہ کے لئے گئے۔ انھوں نے ذکاء اللہ صاحب (زائرین ٹریول ایجنسی) کے نام ایک پرچہ لکھ دیا اور ان کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ میں جب ذکاء اللہ صاحب کے کمرہ کے اندر داخل ہوا تو اسی سوٹیڈ بوٹیڈ شخص کو وہاں بیٹھا دیکھا جو لفٹ میں ہم لوگوں کو ملا تھا، میں انہیں دیکھ کر یکا یک ٹھٹھک گیا۔ پھر آگے بڑھا اور دعاء وسلام کے بعد عبداللہ علاء الدین ندوی کا پرچہ ان کو دیا، انھوں نے پرچہ پڑھا اور کہا: آپ لوگ استخارہ کرکے آئے ہیں یا نہیں؟ اور پھر فضا میں ہم لوگوں کا ایک مشترکہ قہقہ بلند ہوا، اس کے بعد ہم لوگ اپنے پاسپورٹ اور ٹکٹ ان کے حوالہ کرکے واپس چلے آئے۔

ذکاء اللہ صاحب نے امیگریشن اور پی فارم وغیرہ کی کارروائی ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر مکمل کرادی اور ۲۹/اپریل کی سیٹ بھی سعودی ایئر لائن سے بک کرادی، .N.O.C کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ جنتا حکومت اس قانون کو منسوخ کرچکی تھی۔ بمبئی میں ہم لوگوں کا قیام تقریبا اٹھائیس گھنٹہ رہا اور متعدد لوگوں سے اچھی ملاقات رہی جن کے نام اب ذہن میں نہیں رہے۔

بمبئی سے ظہران کے لئے ہماری فلائٹ ساڑھے سات بجے شام کو تھی، فارن کرنسی کے نام پر بینک نے فی نفر چھ ڈالر (اس وقت کے تقریبا ۲۰ ریال) دیئے، ہم لوگوں نے مزید ڈالر لینا چاہے تو بینک کے کلرک نے دینے سے انکار کردیا، کیونکہ ۳۰ سالہ کانگریسی دورِ حکومت کے بہت سے قوانین اسوقت بھی موجود تھے، امیگریشن وغیرہ سے فارغ ہوکر ہم لوگ ڈیپارچر ہال میں آکر بیٹھ گئے، جب جہاز کی روانگی کا وقت قریب آیا تو سعودی ائرلائنس کا ایک کارکن ہمارے پاس آیا اور بولا کہ آپ لوگ اپنے اکنامی کلاس کا بورڈنگ پاس مجھے دیدیجئے اور فرسٹ کلاس کا بورڈنگ پاس لے لیجئے، چنانچہ جب سعودی ائرلائنس کی طرف سے جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا تو ہم لوگ فرسٹ کلاس میں جاکر بیٹھ گئے۔ اس وقت دہلی سے ظہران یا ریاض کے لئے ڈائرکٹ کوئی فلائٹ نہیں تھی، تمام فلائٹیں ممبئی سے کراچی پھر ریاض جاتی تھیں، یا بمبئی سے ظہران پھر ریاض جاتی تھیں۔ دہلی سے ریاض اور ریاض سے دہلی براہ راست فلائٹ غالبا ۱۹۸۲ء میں شروع ہوئی ہے، یہ جہاز سیدھے ظہران جارہا تھا اس لئے اسے ساڑھے تین گھنٹہ میں ظہران پہنچنا تھا۔

لکھنؤ سے دہلی آنیوالا جہاز بوئنگ ۷۳۷ تھا جس میں عموماً ۱۱۰ مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے، ایک لائن میں دائیں بائیں تین تین سیٹیں ہوتی ہیں اور درمیان میں آنے جانے کیلئے ایک راستہ ہوتا ہے۔ دہلی سے بمبئی آنیوالا جہاز Air Bus تھا اس میں عام طور پر ۲۶۰ سیٹیں ہوتی ہیں، ایک لائن میں آٹھ سیٹیں ہوتی ہیں، دو، دو سیٹ دائیں بائیں اور چار درمیان میں۔ اور آنے جانے کیلئے دو راستے ہوتے ہیں۔ ظہران جانیوالا یہ جہاز ٹری اسٹار Tri Star تھا، اس میں تقریبا ۳۲۰ مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے ایک لائن میں نو سیٹیں ہوتی ہیں۔ دائیں بائیں دو دو سیٹ، اور درمیان میں پانچ سیٹیں ہوتی ہیں، اور درمیان میں دو راستے ہوتے ہیں، اس وقت تک سعودیہ کے پاس جمبو Jumbo 747 جہاز بہت کم تھے اس لئے اس روٹ پر ٹری اسٹار ہی چلتا تھا، اب کافی عرصہ سے جمبو 747 جہاز

ہی سعودی عرب سے ممبئی دہلی، مدراس اور حیدرآباد آتے جاتے ہیں اس میں ۳۵۰ سیٹیں ہوتی ہیں، جمبو جہاز کی ایک دوسری قسم دومنزلہ ہوتی ہے اس میں تقریبا ۴۰۰ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک لائن میں ۱۰ سیٹیں ہوتی ہیں، تین تین دائیں بائیں اور چار سیٹیں درمیان میں اور بیچ میں دو راستے ہوتے ہیں، دوسری منزل میں تقریباً ۶۰ مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ مختلف ماڈل کے جہازوں میں سیٹیں ایئرلائن والوں کی صوابدید پر کم یا زیادہ بھی کی جاسکتی ہیں، فرسٹ کلاس کی سیٹوں کی کمی بیشی سے بھی مجموعی سیٹوں کی تعداد میں کمی زیادتی ہوسکتی ہے، سب سے زیادہ آرام دہ جہاز ٹری اسٹار ہی ہوتا ہے اس میں دو انجن پروں میں اور ایک انجن دم کے اوپر ہوتا ہے اور جمبو میں ہر پر میں دودو انجن ہوتے ہیں باقی تمام جہازوں میں صرف ایک ایک انجن ہر پر میں ہوتا ہے۔ ۱۹۹۷ء سے سعودیہ ائرلائن اور دیگر عربین ویورپین ایئرلائنوں نے اپنی فلائٹوں میں دورانِ پرواز فون کرنے کی سہولت بھی مہیا کردی ہے، آپ کو دنیا کے کسی بھی حصہ میں فون کرنا ہو، آپ اپنی اس خواہش کا اظہار جہاز کے عملہ کے کسی فرد سے کریں تو وہ آپ کو MOBILE فون لاکر دیدیگا، آپ اپنی مطلوبہ جگہ فون کرکے فون عملہ کو واپس کردیں، اور اسی کو جتنی دیر بات کی ہے فی منٹ ۲۵/ریال کے حساب سے پیسے ادا کردیں۔ اب تو بعض ایئرلائنوں نے اپنے جہازوں کی ہر سیٹ کے سامنے ٹی وی بھی لگانا شروع کردیا ہے۔

جہاز کی پرواز کے دوران تقریباً دو گھنٹہ کے بعد اعلان ہوا کہ اس وقت ہمارا جہاز متحدہ عرب امارات کے اوپر پرواز کررہا ہے، کھڑکی سے زمین کی سمت دیکھا تو پورا شہر قمقموں اور جھالروں جیسا معلوم ہورہا تھا، اور سڑکوں پر چلتی ہوئی کاریں ہار کی لڑیاں معلوم ہورہی تھیں، اس اعلان کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد جہاز ظہران کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لینڈ ہوگیا۔ (اب ظہران میں ایک نیا ایئرپورٹ "**مطار الملک فهد**" کے نام سے بن گیا ہے اور ساری فلائٹیں وہیں جاکر اترتی ہیں) ہم لوگ ہیلتھ سرٹیفیکٹ (اس کی اب ضرورت نہیں رہی) کی جانچ اور امیگریشن کے بعد کسٹم ہال پہنچے، سلمان حسینی ندوی کے پاس پندرہ بیس شیشیاں ہومیو پیتھک دواؤں کی تھیں، کسٹم آفیسر نے دوائیں روک لیں اور کہا کہ تھوڑی دیر انتظار کریں، قریب ہی ایک کسٹم آفیسر کے کاؤنٹر کے پاس ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے، پہلی بار ہم نے وہیں بلوریں فنجانوں میں بغیر دودھ کی چائے پی اور یہ سمجھتے رہے کہ ہم قہوہ پی رہے ہیں، تاخیر کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کا انتظار ہے وہی فیصلہ کرے گا کہ یہ دوائیں ہیں یا کچھ اور ہے، بہر حال جب ڈاکٹر صاحب

آئے تو ان کو بتایا اور سمجھایا گیا کہ یہ دوائیں ہیں تو انھوں نے تھوڑی ردوقدح کے بعد دوائیں لیجانے کی اجازت دیدی لیکن آئندہ لانے سے منع کردیا۔ عرب ممالک ہومیو پیتھک طریقۂ علاج سے ناواقف ہیں، اور ان دواؤں میں چونکہ الکوحل ملی ہوتی ہے اس لئے دارالافتاء کے فتوی کے مطابق ان کا استعمال کرنا حرام ہے اسی لئے آج بھی عرب ممالک، خاص طور پر سعودی عرب میں ہومیو پیتھک دوائیں لیجانا سخت منع ہے۔

وہیں چائے پیتے وقت نگاہ دیوار پر لگی گھڑی پر گئی تو دیکھا کہ آٹھ بجا ہے، خیال ہوا کہ شاید گھڑی رک گئی ہے، لیکن جب غور کیا تو گھڑی چل رہی تھی، بڑی حیرت ہوئی کہ ساڑھے سات بجے تو ہم بمبئی سے جہاز میں بیٹھے ہیں اور تین گھنٹہ ہم نے سفر کیا ہے مگر یہاں کی گھڑی کے حساب سے تو ہم آدھے گھنٹہ ہی میں ظہران پہنچ گئے۔ کیسے؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا، بعد میں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں سعودی عرب سے ڈھائی گھنٹہ پہلے سورج نکلتا ہے اس لئے وہاں اور یہاں کے وقت میں ڈھائی گھنٹہ کا فرق ہے اسی لئے ہم آدھے گھنٹہ میں ظہران پہنچ گئے۔

کسٹم ہال سے نکلنے کے بعد ہم لوگ ظہران کے داخلی Domestic ایئرپورٹ پہنچے، جو انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے قریب ہی تھا، جہازوں کا چارٹ دیکھا تو معلوم ہوا کہ تقریباً ہر دوسرے تیسرے گھنٹہ ریاض کے لئے جہاز ہے، اطمینان ہوا کہ جب وقفہ وقفہ سے اتنے جہاز ہیں تو کسی نہ کسی جہاز میں جگہ مل ہی جائیگی اور رات ائرپورٹ پر نہیں گذارنا پڑے گی۔ مگر جب بکنگ کاؤنٹر پر پہنچے تو یہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی کہ صبح سوا سات بجے سے پہلے کسی جہاز میں جگہ نہیں ہے، مجبوراً اسی جہاز میں سیٹ بک کرائی، بعد میں معلوم ہوا کہ شاہ خالد امریکہ سے اپنے پیر کا کامیاب علاج کراکر آج ہی سعودی عرب واپس لوٹے ہیں اس لئے لوگ ان کو مبارکباد دینے کیلئے ریاض جارہے ہیں، اسی لئے جہاز میں جگہ نہیں ہے ورنہ عموماً جہازوں میں جگہ مل جاتی ہے۔ بہر حال رات ظہران ایئرپورٹ پر ٹہلتے یا کرسی پر اونگھتے، سوتے گزر گئی، صبح نماز فجر اور ہوٹل میں ناشتہ سے فارغ ہوکر CHECK IN کے مرحلہ سے گزر کر "**السعودية**" جہاز پر سوار ہوگئے، ایک گھنٹے سے پہلے ہم لوگ ریاض ایئرپورٹ پہنچ گئے، ریاض میں کسٹم وغیرہ نہیں ہوا، فوراً ٹیکسی کرکے ہم لوگ جامعہ کے دفتر "**عمادة شئون الطلاب**" پہنچے، یہاں کے لوگ بڑے تپاک سے ملے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم لوگ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے آئے ہیں تو بہت خوش ہوئے، اور حضرت مولانا علی میاںؒ کی خیریت پوچھتے رہے، اور ان کے بارے میں مختلف سوالات کرتے رہے۔

”عمادة شئون الطلاب“ سے فارغ ہوکر ہم لوگ سلیم الرحمان خاں ندوی بھوپالی (حال مقیم جاپان) کے کمرے پہنچے، یہ ہم لوگوں سے پانچ چھ ماہ قبل ریاض پہنچ گئے تھے اور ہم لوگوں کے ویزے اور ٹکٹ کیلئے انھوں نے بھی بڑی دوڑ بھاگ کی تھی۔ اس وقت بھی انھوں نے ہم لوگوں کی کئی دن تک بڑی خاطر و مدارات کی، ہاسٹل وغیرہ کی ساری کارروائی مکمل کروائی اور ہر طرح کی سہولتیں بہم پہونچائی۔

❁❁❁

دیر آید درست آید

ہم لوگ ریاض یکم مئی ۱۹۷۷ء کو پہنچے تھے اس وقت یونیورسٹی کے تعلیمی سیشن کا آخری دور چل رہا تھا اور امتحان شروع ہونے میں صرف ۲۰-۲۵ روز باقی تھے امتحان میں شرکت کے لئے ۷۵ فیصد اوسط حاضری ضروری تھی اس لئے ہم لوگوں کو کلاس میں بیٹھنے کی اجازت تو مل گئی لیکن امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی، جب تک تعلیم ہوتی رہی ہم لوگ بھی کلاس جاتے رہے تاکہ وہاں کے ماحول سے مانوس ہوسکیں اور جب امتحان شروع ہوگئے تو ایک بڑی خوش خبری یہ سننے کو ملی کہ اس سال سے تمام غیر ملکی طلباء کو چھٹیوں میں اپنے وطن جانے کے لئے ائر ٹکٹ دیا جائے گا۔

اللہ تعالی کی مصلحتوں کو وہی خوب جانتا ہے عرب ملکوں میں بی-اے چار سال کا ہوتا ہے۔ اگر میرا داخلہ پہلے مدینہ یونیورسٹی میں ہوگیا ہوتا تو اولاً بی-اے میں داخلہ ہوتا، دوسرے چار سال سے پہلے (بی-اے کا کورس مکمل کرنے سے پہلے) لکھنؤ آنے کو نہ ملتا، تیسرے بی-اے میں اسکالرشپ صرف تین سو ریال ماہانہ ملتا، جبکہ ایم-اے میں ۶۰۰/ اسکالرشپ ماہانہ تھا، اس لئے میرے ساتھ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا، اور ”دیر آید درست آید“ کے مصداق ہوا۔

ایک چوتھی خوش قسمتی جیسے ہم لوگوں کا انتظار کر رہی تھی وہ یہ کہ جس روز ہم لوگ ریاض پہنچے اس سے ایک روز قبل شاہ خالد امریکہ سے اپنا کامیاب آپریشن کرا کے واپس آئے تھے، ان کی بخیریت ریاض واپسی کی خوشی میں جگہ جگہ استقبالیہ گیٹ بنائے گئے تھے وہ جوں کے توں برقرار تھے، انہی گیٹوں نے گویا ہم لوگوں کا بھی استقبال کیا۔ اور تیسری صبح شاہ خالد کا شاہی فرمان صادر ہوا کہ حکومت کے تمام اداروں کے افراد کی تنخواہوں اور اسکالرشپ میں ۵۰ فیصد کا اضافہ کیا جاتا ہے، چنانچہ ہم لوگوں کا اسکالرشپ جو پہلے ۶۰۰ سو ریال تھا، ایک دم بڑھ کر ۹۰۰ ریال ہوگیا۔

ابھی ہم لوگوں کے داخلہ کی ابتدائی کارروائی چل ہی رہی تھی کہ ایک روز میں اور سلمان الحسینی مشہور شامی عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سے ملاقات کے لئے ان کے گھر گئے جن کی رہائش گاہ ہم لوگوں کے ہاسٹل سے قریب ہی تھی، ندوہ میں ہم لوگ ان سے ایک بار ملاقات کر چکے تھے، سلام ودعا کے بعد انھوں نے مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی خیریت دریافت کی اور ندوہ سے متعلق سوالات کرتے رہے، ساتھ ہی مشروبات کا دور چلتا رہا، ہم لوگوں نے ان سے داخلہ کے سلسلہ میں مشورہ چاہا تو انھوں نے

''كلية اصول الدين ''میں داخلہ کا مشورہ دیا،اور یہ بھی بتایا کہ آئندہ سال سے انشاءاللہ میں بھی '' كلية اصول الدين '' میں پڑھاؤں گا، یہ سن کر ہم لوگوں کو بڑی تقویت اور خوشی ومسرت ہوئی کہ اس طرح سے ہم لوگوں کا ان سے ربط وتعلق قائم رہے گا اور ہم لوگوں کو ان سے مستفید ہونے کا موقع بھی ملے گا۔مختصر سی مجلس کے بعد ہم لوگ واپس چلے آئے، شیخ نے حدیث وفقہ پر بہت وقیع کام کیا ہے خصوصاً مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی بعض کتابوں کی شروح وحواشی لکھے ہیں اور بعض کو ایڈیٹ کر کے دوبارہ شائع کرایا ہے، میں نے اور سلمان الحسینی نے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے مشورہ کے مطابق كلية اصول الدين کے شعبہ''قسم التفسير والحديث ''میں داخلہ لے لیا،اور شفیق احمد اور نظام الدین نے كلية اصول الدين ہی کے دوسرے شعبہ''قسم العقائد والمذاهب المعاصرة''میں داخلہ لیا،سلیم الرحمٰن خاں'' المعهد العالى للدعوة ''کے قسم الإعلام میں پہلے ہی داخلہ لے چکے تھے اور اسی میں پڑھ رہے تھے۔ كلية اصول الدين اور المعهد العالى للدعوة کی عمارتیں قریب قریب تھیں،صبح کے وقت کلیہ (بی۔اے) کے درجات لگتے تھے اور شام کے وقت عصر بعد سے دراسات علیا (ایم اے) کے درجات لگتے تھے،ہم سب چونکہ دراسات علیا کے طالب علم تھے اس لئے شام کو ایک ساتھ جامعہ کی بس میں کلیہ پڑھنے جاتے تھے، جامعہ اس وقت موجود کیمپس کے اندر نہیں تھی بلکہ اس کے کالجز اور ہاسٹل شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

ہم لوگوں کے داخلہ کی تمام دفتری کاروائی وکیل کلیہ''صالح القصير''نے مکمل کرائی تھی یہ ہم لوگوں کے ساتھ پڑھتے بھی تھے،عمید سے ملنے کا ہم لوگوں کو اتفاق نہیں ہوا تھا، جب پہلے روز ہم لوگ عصر کے بعد تعلیم کے لئے'' كلية اصول الدين '' آئے تو سب سے پہلے کلیہ کے دفتر پہنچے تاکہ مزید کچھ کام باقی رہ گیا ہو تو وہ بھی مکمل ہو جائے اور ہم لوگوں کو درجہ میں بٹھا دیا جائے، دفتر کے اندر داخل ہوئے تو وہاں ایک صاحب کو بیٹھا ہوا پایا، وہ بڑے تپاک سے ملے اور ضرورت دریافت کی تو ہم لوگوں نے کہا ہم لوگ پہلی بار کلیہ آئے ہیں اور کلاس میں بیٹھنا چاہتے ہیں، تو وہ خود دوسری منزل سے اتر کر نیچے آئے اور ہم لوگوں کو کلاس میں بٹھا کر واپس چلے گئے۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کلیہ كلية اصول الدين کے پرنسپل عبد الكريم محمد اللاحم تھے، ہم لوگ دنگ رہ گئے،اور شرمندہ ہوئے،اور ان کے اخلاق کریمانہ سے بڑے متاثر ہوئے، دیکھنے میں سیدھے سادے ایک معمولی سے انسان معلوم ہوتے تھے، نہ بہترین لباس اور نہ کوئی شان وشوکت، نہ بات کرنے میں کوئی غرور وتمکنت۔یہی حال جامعہ کے اور لوگوں کا بھی پایا، جس کے پاس بھی گئے وہ بڑے تپاک سے ملا اور جو ضرورت ہوئی فوراً اس کو پورا کر دیا۔

پہلا عمرہ اور زیارت مسجد نبوی

جب یونیورسٹی میں امتحانات شروع ہوگئے تو ہم لوگوں نے عمرہ اور زیارت مسجد نبوی کا پروگرام بنالیا اور لاعلمی کی وجہ سے جہاز کے بجائے ٹیکسی سے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے کیونکہ دونوں کے کرایوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ریاض سے مدینہ منورہ ایک ہزار کلومیٹر ہے،سعودی عرب میں ٹیکسی سے اتنے لمبے سفر کا یہ پہلا تجربہ تھا،شیور لیٹ کار نے جب ۱۲۰/اور ۱۵۰/کلومیٹر فی گھنٹہ کی اسپیڈ سے چلنا شروع کیا تو ڈر بھی محسوس ہوا اور تعجب بھی ہوا، کیونکہ گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس برق رفتاری کا اندازہ بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گاڑی ہوا میں تیر رہی ہے۔اب تو ہر بڑے شہر میں پہلے سے بھی زیادہ کشادہ اور چوڑی سڑکیں بن گئی ہیں، عام طور پر تمام ہائی وے تین تین ٹریک کے ہیں یعنی تین سڑکیں آنے کے لئے اور تین جانے کے لئے،لیکن سڑکیں اتنی کشادہ ہیں کہ بلا مبالغہ ان میں سے ہر ٹریک پر پانچ پانچ گاڑیاں بآسانی گذر سکتی ہیں۔

شام کو مغرب کے قریب ہم لوگ ریاض سے چلے تھے اور صبح کی اذان سے پہلے مدینہ منورہ پہنچ گئے، اور مدینہ یونیورسٹی کے اس ہاسٹل میں جا کر اترے جو مسجد نبوی سے بالکل قریب اور جنۃ البقیع سے متصل تھا، درمیان میں صرف ایک سڑک حائل تھی۔اس ہاسٹل میں ندوہ کے کچھ طلباء افتخار احمد ندوی رضوان احمد ندوی وغیرہ مقیم تھے ہم لوگ ایک روز مدینہ یونیورسٹی دیکھنے اور وہاں مقیم ندوی طلباء سے ملنے گئے ، وہاں یحیی اندوری ،معاذ اندوری، وقار صدیقی ندوی اعظمی، ارشاد احمد اعظمی ندوی وغیرہ سے ملاقات ہوئی، ایک روز وقار عظیم ندوی نے ہم لوگوں کو رات کے کھانے پر مدعو بھی کیا۔

ایک روز یحیی اندوری معاذ اندوری وغیرہ کے ساتھ مدینہ منورہ کے تاریخی مقامات مثلاً جبل احد، مسجد قبلتین مسجد قبا وغیرہ بھی گیا۔جبل احد میں زیادہ وقت گزرا گیا۔جبل احد کے اس گوشہ میں بیٹھ کر جہاں حضور ﷺ نے جنگ احد میں زخمی ہونے کے بعد آرام فرمایا تھا، جنگ احد سے متعلق تاریخی واقعات عربی کی مشہور ومعروف کتاب سیرت ابن ہشام سے پڑھے گئے، جس سے جنگ احد اور جبل احد سے متعلق تمام چیزیں ذہن میں اجاگر ہوگئیں۔پھر وہیں جبل احد کے دامن میں کھانا پکایا اور کھایا گیا۔

جس وقت ہم لوگ مدینہ منورہ گئے تھے اس وقت مسجد نبوی کے دونوں صحن کچے تھے اور ان میں بجری پڑی ہوئی تھی ایک روز غالباً صبح دس بجے مسجد نبوی گیا تو دیکھا کہ ایک دروازہ پر ٹرک کھڑا ہے

اور مزدور سنگ مرمر کے پتھر اس سے اتار اتار کر مسجد نبوی کے اندر پہنچا رہے ہیں، اندر جا کر دیکھا تو وہاں کچے صحن میں سنگ مرمر کے پتھر بچھائے جا رہے تھے، میں نے سوچا کہ میں بھی کیوں نہ مسجد نبوی کی تعمیر میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کروں چنانچہ فوراً ایک کرٹرک کے پاس گیا اور جوش وجذبہ کی فراوانی میں ایک ساتھ دو پتھر اٹھا لئے لیکن مسجد نبوی کے صحن میں پہنچانے میں بری طرح ہلکان ہو گیا مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ پتھر اتنے وزنی ہوں گے، مزید پتھر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ایک روز کوئی صاحب مکہ مکرمہ جا رہے تھے سلمان اور نظام ان کے ساتھ جا کر عمرہ کر آئے اور مجھے خبر بھی نہ دی اور صبح ناشتہ میں مجھے بتایا تو پھر مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں سلمان اور نظام کے روکنے کے باوجود - کہ دو ایک دن میں ہم تینوں ہی مکہ مکرمہ عمرہ کے لئے چلیں گے - رکا نہیں اور دوسرے روز تنہا ہی عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ روانہ ہو گیا، وہاں جا کر مدرسہ فخریہ عثمانیہ کے ناظم سید مشتاق حسین صاحب کا مکان تلاش کرنے میں کچھ دقت تو ضرور ہوئی لیکن جب ان کا گھر مل گیا تو ساری کلفت دور ہو گئی، ان ہی کے گھر میں چند دن میرا قیام رہا، اس کے بعد میں تنہا ہی بذریعہ جہاز ریاض واپس ہوا۔

ہم تینوں جب زیارت وعمرہ کر کے واپس آئے تو جامعہ میں امتحان ختم ہونے والے تھے، ریاض پہنچتے ہی ہم لوگوں نے لکھنؤ کا (براستہ ریاض-ممبئی-دہلی-لکھنؤ) واپسی کا رزرویشن کرا لیا۔

ممبئی کے لئے ۷/جولائی ۱۹۷۷ء کی سیٹ بک تھی، ہم لوگ وقت پر ائرپورٹ پہنچ گئے اور ممبئی کی فلائٹ کی روانگی کے اعلان کا انتظار کرتے رہے، جب کافی تاخیر ہو گئی اور ممبئی کی کسی فلائٹ کا کوئی اعلان نہیں ہوا تو تشویش ہوئی، کاؤنٹر پر جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ آج والی فلائٹ ڈائرکٹ ممبئی کے لئے نہیں تھی بلکہ ریاض سے ظہران کے لئے ڈومسٹک فلائٹ تھی، پھر ظہران سے انٹرنیشنل فلائٹ ممبئی کے لئے تھی (ظہران والی فلائٹ کا اعلان برابر ہوتا رہا تھا) اس نے مزید یہ کہا کہ اب ظہران کی فلائٹ سے بھی سفر ممکن نہیں ہے کیونکہ ظہران کی فلائٹ جانے کے لئے پر تول رہی ہے اور آپ کا ٹکٹ ریاض ممبئی دہلی لکھنؤ کا ہے، اسلئے ٹکٹ کا روٹ ریاض ظہران ممبئی دہلی لکھنؤ تبدیل کرانا ضروری ہے، بڑی مایوسی کے عالم میں ہم لوگ ائرپورٹ سے ہاسٹل واپس آئے، لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ دوسری سیٹ ۹/جولائی کی ڈائرکٹ ممبئی کے لئے Ok ہے، ورنہ معلوم نہیں کتنے روز سیٹ ملنے کے انتظار میں رکنا پڑتا، اسی روز دوپہر میں جب یونیورسٹی کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے گئے تو معلوم ہوا کہ پاکستان میں فوجی انقلاب

سعودی عرب میں تیئیس سال

آ گیا ہے، ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا ہے اور جنرل ضیاء الحق اس کے سربراہ ہیں، بہر حال کسی طرح یہ دو روز گزارے اور ۹/جولائی کو ممبئی کے لئے روانگی ہو گئی، شام کو ممبئی پہنچے تو معلوم ہوا کہ میرا ایک سامان نہیں آیا ہے، مجبوراً سامان کی گمشدگی کا اندراج ائرلائن آفس میں کرایا اور کسٹم وغیرہ سے فارغ ہو کر حافظ مرغوب صاحب کے پاس پہنچ گئے، صبح انڈین ائرلائن کے آفس جا کر دہلی اور لکھنؤ کی سیٹ بک کرائی۔

دوسرے روز شام کو ہم لوگ دہلی کے لئے روانہ ہوئے، رات دہلی ائرپورٹ پر گزاری اور صبح ۶/بجے کی فلائٹ سے لکھنؤ پہنچ گئے۔ لکھنؤ ائرپورٹ پر کافی تعلق والے اور کچھ عزیز بھی موجود تھے، ندوہ کی گاڑی بھی موجود تھی سب سے پہلے یہ قافلہ امین آباد محمد علی لین، سلمان حسینی ندوی کے گھر گیا، وہاں ناشتہ وغیرہ ہوا پھر بقیہ قافلہ کیساتھ میں ندوہ آیا، گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی بعض اساتذہ مل گئے ان سے سلام ودعا ہوئی پھر میں دارالعلوم کے دوسرے حضرات سے ملاقات کے لئے اور آگے بڑھ گیا، گھر کے افراد دروازے پر میرا انتظار کر رہے تھے، میں جب آدھے گھنٹے کے بعد گھر میں داخل ہوا تو سب کو سراپا انتظار پایا تو یکایک احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی، پہلے مجھے گھر آنا چاہئے تھا اس کے بعد دوسروں سے ملنے دارالعلوم جانا چاہئے تھا۔

یونیورسٹی کے پاسپورٹ آفس سے متعلق کسی فرد کی غلطی سے میرا خروج وعودہ کا ویزا بجائے چار ماہ کے دو ماہ کا لگ گیا تھا جس کا علم مجھے لکھنؤ پہنچنے کے بعد ہوا تو بڑی کوفت ہوئی، اس لئے مجبوراً مجھے آخری شوال میں تنہا ہی ریاض واپس آنا پڑا، پڑھائی حج بعد شروع ہونا تھی، ایک ماہ کسی نہ کسی طرح گذارا، اس کے بعد میں حج کی تیاریوں میں لگ گیا۔ ریاض سے بذریعہ جہاز حج کرنے کے لئے میں تنہا ہی نکلا، مکہ مکرمہ میں مدرسہ فخریہ عثمانیہ کے آفس میں قیام رہا، اتفاق سے حج سے ایک روز پہلے میں جب آفس سے نیچے اترا تو اچانک فضل الٰہی بھائی ساکن ٹیلہ شاہ پیر محمد علی لکھنؤ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ نظر آ گئے، یہ لوگ اسی وقت مکہ مکرمہ پہنچے تھے، ان سے ملاقات ہوئی اور یہ طے پایا کہ ہم چاروں ایک ساتھ ہی حج کریں گے، میرے دادا اور ان کے والد سید شاہ واعظ حسنؒ نے ایک حج ساتھ ہی کیا تھا، چنانچہ ۸/ذوالحجہ کی صبح فجر بعد ہم چار آدمیوں کا قافلہ پاپیادہ منیٰ کے لئے روانہ ہو گیا۔

پہلے عمرہ اور پہلے حج میں دل کی جو کیفیت تھی اور جو لطف اور سرور تھا وہ بعد میں بتدریج کم ہوتا چلا گیا، یہ ایک فطری بات ہے جو ہر ایک کو پیش آتی ہے، جب کوئی چیز عادت یا رسم بن جائے تو پھر اس سے اس کی روح نکل جاتی ہے صرف جسم یا صورت باقی رہ جاتی ہے۔

سعودی عرب: ایک معاشرتی جائزہ

۲۷/اپریل کو اموسی ائر پورٹ سے دہلی ممبئی ظہران ہوتے ہوئے یکم مئی کو جب میں ہندوستان جیسے زرخیز ملک، لکھنؤ جیسے پررونق شہر، اور ندوہ جیسے عالمی ادارے کے ماحول سے نکل کر پہلی بار سعودی عرب کی راجدھانی ریاض پہنچا تو اجنبی ماحول، اجنبی زبان (عربی دارجہ) اور اجنبی لوگوں سے واسطہ پڑا تو ایسا محسوس ہوا جیسے واقعی میں کسی صحرا میں نکل آیا ہوں اور یکا یک ذہن میں یہ شعر آ گیا ؎

قدم قدم پہ کبھی انجمن تھی ساتھ مگر
ہے اب یہ حال کہ سایہ بھی ہم رکاب نہیں

ظہران سے ریاض اپنے ٹھکانے پہنچنے کے بعد خود کو اجنبی ماحول، اجنبی چہرے، اجنبی طرز معاشرت، اجنبی زبان میں گھرا ہوا پایا، ہر چند کہ عربی زبان آتی تھی لیکن فصیح عربی اور روزمرہ کی عربی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہی فرق جو لکھنؤ شہر کی زبان اور کسی دور افتادہ گاؤں کی زبان میں ہے، آپ ہی بتائیں اگر آپ سے کوئی ''ھات الم'' یا ''البی محروء'' یا ''گرَیتُ و گرَیتُ'' کہے تو آپ کی سمجھ میں کیا آئے گا، جبکہ پہلا لفظ ''ھات قلم'' دوسرا ''قلبی محروق'' اور تیسرا ''قرأت وقرأت'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

چونکہ یہاں کے مدارس وجامعات میں اکثریت مصری مدرسین کی ہے اس لئے ان کی زبان وثقافت کا اثر یہاں کی زبان وثقافت پر بھی پڑا ہے، مصری عام طور پر بولتے وقت ''ق'' کو کبھی ''الف'' سے اور کبھی ''گ'' سے اور ''ج'' کو ''گ'' سے بدل دیتے ہیں مثلاً قلم کا تلفظ ''الم'' یا ''گلم'' کرتے ہیں، اور ''حاَج'' کا تلفظ ''حاگ'' سے کرتے ہیں، اس کے علاوہ لہجہ میں بھی بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ وہاں کی عربی عامیہ زبان سمجھنے میں کچھ وقت تو لگا مگر پھر میں بھی ان ہی کی زبان اور لب ولہجہ میں بات کرنے کا عادی ہو گیا۔

اگر آپ بازار میں اپنی ندوہ کی پڑھی ہوئی فصیح وبلیغ عربی زبان دانی کا مظاہرہ کرنے لگیں تو لوگ آپ کو ایک عجوبہ سمجھیں گے، ایک بار دیرہ کی مارکیٹ میں میں نے ایک یمنی سے اپنی فصیح وبلیغ عربی میں غالباً کسی دوکان کا پتہ پوچھا تو اس نے ایک بار تو اپنا سوال دوبارہ دہرانے کی خواہش ظاہر کی، جب میں نے پھر وہی الفاظ دہرائے تو وہ حیرت سے میرا منھ تکنے لگا۔ لیکن آخر کب تک؟ دونوں نے عافیت

وہاں سے کھسک جانے ہی میں سمجھی، میں نے اپنا راستہ لیا، اور اسنے اپنا راستہ لیا، لیکن میں راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ آخر میں نے کون سا لفظ غلط استعمال کیا جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

ریاض پہنچنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز نے متاثر کیا وہ عربوں کا اخلاق تھا عمادة شئون الطلاب سے لے کر ''وحدة القادسية'' اور ''وحدة اليرموك'' ہاسٹل تک ہر ایک نے ''حياك الله'' اور ''بارك الله'' جیسے جملوں سے استقبال کیا، کتنوں ہی نے اپنے کمرہ آنے کی دعوت دی اور کتنوں ہی نے عذر ومعذرت کرنے کے باوجود چائے اور دیگر لوازمات سے ضیافت کی۔ عربوں کو دیکھ کر ان کے پاس بیٹھ کر اور ان سے گفتگو کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ مال ودولت کی فراوانی نے ان کو دینی شعائر اور اسلامی تعلیمات سے غافل ضرور کر دیا ہے، لیکن ان کے اندر کبر ونخوت، تکبر وغرور کے جراثیم نہیں پیدا کر سکی ہے، یہی وجہ ہے کہ اب بھی ان کے یہاں پہلی جیسی تواضع وانکساری، ضیافت ومہمان نوازی کے اوصاف موجود ہیں، یہ بھی ایک بڑی خوبی ہے، ورنہ دولت تو انسان کے اندر سب سے پہلے کبر ونخوت کے جراثیم ہی پیدا کرتی ہے بعد میں دوسری خرابیاں پیدا ہوتیں ہیں۔

عربوں کے ساتھ رہنے سے، ان کی عادات واطوار اور ان کی معاشرت سے بھی واقفیت ہوئی، جس سے اندازا ہوا کہ عجلت پسندی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، ان کی عجلت پسندی کا سب سے زیادہ نمایاں مظاہرہ سڑکوں پر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ شرح اموات ٹریفک حادثات میں سعودی عرب ہی کی ہے۔ یہاں شہر کے اندر بھی ۱۰۰ یا اس سے بھی زیادہ رفتار سے اور ہائی وے پر ۱۵۰ رکی رفتار سے گاڑی چلاتے ہیں۔ ریاض، جدہ، مکہ مکرمہ جیسے شہروں کی سڑکوں کی نگرانی کمپیوٹر کے ذریعہ ہوتی ہے اور کوئی حادثہ ہونے پر ٹریفک پولیس فوراً وہاں پہنچ جاتی ہے۔ حادثات کی کثرت کی وجہ سے حکومت کی طرف سے عام سڑکوں پر ہائی وے پر مختلف قسم کے بورڈ لگا دیئے گئے ہیں جن میں مناسب اسپیڈ سے گاڑی چلانے کی ترغیب اور تیز رفتاری کے بھیانک انجام کی تصویر سامنے آتی ہے۔ چند بورڈوں کی عبارتیں ملاحظہ ہوں:

''لاتسرع فإن الموت أسرع''
(جلدی نہ کرو کیوں کہ موت تم سے بھی تیز رفتار ہے)
''كرسي القياده ام سرير في المستشفى''
(ڈرائیونگ سیٹ پسند ہے یا اسپتال کی چارپائی پسند ہے)

''یا ابی لا تسرع، وعدالینا سالما، نحن بانتظارك''

(اباجان جلدی نہ کریں تا کہ ہمارے پاس صحیح سالم لوٹ کر آئیں، ہم آپ کے منتظر ہیں)

''السرعة موت محقق''

(تیز رفتاری میں موت یقینی ہے)

دوسری طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بورڈ ایسے بھی نظر آئیں گے جن میں اذکر اللہ، اشکر الله ، استغفر الله، الحمد لله وغیرہ بھی لکھا ہوا ہے۔

جس طرح یہاں کی پرائیویٹ بسوں پر مختلف قسم کے جملے یا اشعار لکھے ہوتے ہیں اسی طرح وہاں کی بسوں اور گاڑیوں پر بھی بعض جملے یا اشعار لکھے ہوتے ہیں جو بس کے مالک یا ڈرائیور کی ذہنی وفکری سوچ کی غمازی کرتے ہیں، بعض جملے یا اشعار بڑے مؤثر ہوتے ہیں مثلاً

" علی کف القدر نمشی،ولا ندری عن المکتوب"

(ہم تقدیر پر بھروسہ کر کے چلتے ہیں قسمت کا لکھا ہم نہیں جانتے)

" لا تکن للعیشس مجروح الفواد، إنما الرزق علی رب العباد"

(روزی کے لئے پریشان نہ ہو، روزی تو بندوں کے رب کے ذمہ ہے)

"الصبر جمیل" (صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے)

"اعمل جمیلا ، طول العمر ما تندم" (نیکی کرو زندگی بھر شرمندہ نہ ہوگے)

اور بعض جملے یا اشعار ڈرائیور یا مالک کی ذہنی ومعاشرتی اور نفسیاتی کیفیات کو اجاگر کرتے ہیں مثلاً:

"جر حتنی العیون السود"

(مجھے سیاہ آنکھوں نے گھائل کر دیا)

"الدنیا محطات الدموع، واجمل فیها الحب واصعب مافیها الفراق"

(دنیا آنسوؤں کی آماجگاہ ہے، اس کی سب سے زیادہ خوبصورت چیز محبت ہے اور سب سے زیادہ کٹھن چیز محبوب کی جدائی ہے)

"الحب عذاب" (محبت عذاب ہے)

"الشمس تطلع وتغیب واللیل یجمع کل حبیب"

سورج نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے، اور رات عاشق ومعشوق کو جمع کر دیتی ہے۔

سعودی عرب: ایک عام جائزہ

اب آیئے آپ کا تھوڑا بہت تعارف سعودی عرب کے اقتصادی نظام، تعلیمی نظام، طبی نظام، تجارتی نظام، سے بھی کرا دیں تا کہ آپ کو وہاں کے مزاج، سیاست، پالیسی اور وہاں کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا اندازہ لگانے میں آسانی ہو۔ ان نظاموں کے تعارف کیلئے میں نے پاکستان کے ایک مشہور ادیب صدیق سالک کی کتاب ''تادم تحریر'' کے کچھ اقتباسات (صفحہ ۱۶۷/تا ۱۷۵) مستعار لئے ہیں ان کی تحریر عربی رسم الخط میں ہے اور اس پر میرے اضافے یا تبصرے خط نستعلیق میں ہیں وہ لکھتے ہیں:

اقتصادی نظام:

" بہت سھل اور سادہ ھے، پیاز ٹماٹر سے لے کر ڈاکٹر اور سر جن تك باھر سے منگوائے جاتے ھیں اور جوابا تیل اور تیل کی مصنوعات دساور کو بھیجی جاتی ھیں ، یھاں اکثر لوگ تیل کی دھار دیکھنے میں مصروف رھتے ھیں"۔

(کیوں کہ تیل ہی کے اتار چڑھاؤ سے دوسرے ملکوں کی اقتصادی حالت متاثر ہوتی ہے اور مختلف قوموں کے مزاج پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ شاہ فیصل مرحوم نے ۱۹۷۳ء میں جب امریکہ بہادر کے تیل میں صرف ۱۰/فی صد کٹوتی کی تھی تو امریکہ کو اپنے قدموں تلے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی، اس کا بدلہ امریکہ نے سعودی عرب ہی نہیں بلکہ دوسرے تیل نکالنے والے عرب ملکوں سے بھی ان کے پٹرول کے کنوؤں پر قبضہ کر کے لے لیا، آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ظہران کے ساحل سے لے کر ینبع کے ساحل تک تقریباً ۱۵/سو کلومیٹر لمبی پٹرول کی پائپ لائن دوڑی ہوئی ہے، جس کا قطر کہا جاتا ہے کہ دو میٹر ہے، یہ صرف اس لئے ہے کہ امریکہ بہادر کو بحر احمر کے ساحل پر ہی پٹرول ان کے بحری ٹینکوں میں بھر کر دے دیا جائے اور ان کے ٹینکروں کو پٹرول لینے کے لئے بحر عرب کا چکر نہ لگانا پڑے، بحر احمر سے تیل لے کر یہ ٹینکر نہر سوئز میں داخل ہو جاتے ہیں اور وہاں سے بحر ابیض میں داخل ہو کر کم سے کم وقت میں امریکہ پہنچ جاتے ہیں۔)

تجارتی نظام:

یھاں کاروبار کے اوقات بڑے اچھے ھیں کیوں کہ یہ گاھك کے بجائے

دوکانداد کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں، اس کا من چاہا تو دوکان کھول لی اور جی چاہا تو بند کردی، اگر دونوں خواہشیں بیک وقت حملہ آور ہوگئیں تو دوکان کھول کر بیٹھ گئے اور چیزیں بیچنے سے انکار کردیا۔

(جی ہاں پہلے ایسا ہی تھا مگر اب معاملہ الٹ گیا ہے، پہلے دوکاندار کی مرضی چلتی تھی، اور کچھ کہنے سننے والے خریدار کو دوکان کے باہر کردیا جاتا تھا، اور اب خریدار کو خوشامد کرکے اندر لایا جاتا ہے تاکہ وہ اس کی دوکان سے کچھ خرید لے۔ پہلے حکومت مقامی لوگوں کی خوشامد کرکے ان کو ملازمت دیتی تھی اور یہ لوگ ملازمت سے دامن بچاکر تجارت کی طرف بھاگتے تھے، کیونکہ تجارت میں فائدہ زیادہ تھا اور ملازمت میں آمدنی کم تھی، اور اب یہی لوگ (جب کہ تجارت چوپٹ ہوچکی ہے) ملازمت کے لئے حکومت کا پیچھا نہیں چھوڑتے، اور سرکاری لوگوں کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں پھر بھی ملازمت نہیں ملتی۔ تجارت ہاتھ سے خود چلی گئی ہے اور ملازمت کوشش کے باوجود مل کے نہیں دیتی، البتہ کچھ ہوشیار اور قسمت کے دھنی ایسے بھی ہیں جو کسی غیر ملکی کو دوکان کھلوا کر اور منافع میں شریک ہوکر ملازمت بھی کرلیتے ہیں اور تجارت بھی کرلیتے ہیں۔)

''دوکانوں میں بست وکشا کا یہ عالم دیکھا کہ جب بھی کسی چیز کی اشد ضرورت ہوئی دوکانیں بند پائیں اور جب خریداری کے لئے جیب میں پیسہ نہ ہو تو تمام دوکانیں کھلی پائیں"۔

(پہلے ایسا ہی تھا مگر اب کساد بازاری کی وجہ سے دوکانیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں، دوکاندار خود اب اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی طلب گار آئے تو اس کی ضرورت کا سامان اس کے گھر تک پہنچادیں۔)

"ماہ رمضان میں اکثر شہروں میں ساری رات دوکانیں کھلی رہتی ہیں تاکہ لوگ عبادت نہ کر سکیں، اور دن کو سارا وقت بند رہتی ہیں تاکہ کوئی خریداری نہ کرسکے"۔

(جی ہاں! یہ حقیقت ہے کہ رمضان میں وہاں آج بھی رات بھر دوکانیں کھلی رہتی ہیں۔ اور بعض سرکاری آفس اور بینک بھی کافی رات تک کھلے رہتے ہیں، اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جو چیز جہاں ملنی چاہئے وہیں مل بھی جائے، میں خود وہاں کے دواخانوں میں مچھلی کے تیل کے کیپسول COD

LIVER OIL CAPSULE تلاش کرکے تھک گیا لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، بڑی حیرت تھی کہ یہ کیپسول یہاں کیوں نہیں ملتے، ایک روز ایک جنرل اسٹور میں کچھ لینے گیا تو وہاں اتفاقیہ ''کاڈ لیور آئل'' کی شیشی پر نظر پڑگئی، حیرت ہوئی کہ دوا خانے کی چیز دوا خانے میں نہ ملے اور جنرل اسٹور میں مل جائے۔)

''یہی حال دفتروں کا ہے کیا مجال کہ وقت ضرورت متعلقہ آفیسر آپ کو مل جائے اور اگر خوش قسمت ہوئے اور دونوں دستیاب ہوئے تو ہوگا وہی جو منظور افسر ہوگا، یعنی آپ دفتر میں ویزا لگوانے گئے تو ضروری نہیں کہ ویزا ہی لگے، جرمانہ بھی لگ سکتا ہے، آپ کوئی سرٹیفکٹ لینا چاہیں تو آپ کو ملک بدر ہونے کا پروانہ بھی مل سکتا ہے"۔

(یہی نہیں بلکہ ایک افسر نے اگر کسی بات کا انکار کردیا تو دوسرا افسر بھی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا، خواہ وہ اس سے بڑا افسر ہی کیوں نہ ہو۔)

ترقیاتی نظام:

یہاں کی ترقی کا راز ٹھیکہ میں ہے، کوئی سڑک بنوانی ہے تو ٹھیکہ، ہسپتال چلانا ہے تو ٹھیکہ، تعلیم پھیلانی ہے تو ٹھیکہ۔ مشرقی وسطی میں اس نظام کو بڑے صاف ستھرے اور کامیاب طریقے پر چلایا جارہا ہے کیوں کہ اس کے لئے حکام کو سال میں ایک مرتبہ صرف چیک پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جو انہیں کرنے آتے ہیں۔ وہ ہرگز اس تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے کہ کوئی دفتر لیٹ آیا کسی نے فالتو اور ٹائم لیا ..... وہ اس جھنجھٹ میں بھی نہیں پڑتے کہ تعلیم کے لئے استانیاں شاداب ہیں یا ناشاد، ہسپتال میں دوائیں کم یاب ہیں یا نایاب، سب ٹھیکہ کی ذمہ داری ہے۔

(جی ہاں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک فوجی گروپ کی ٹریننگ ہو رہی تھی مشق کے لئے ایک خندق کھودنے کے لئے کہا گیا ان لوگوں نے ORDER IS ORDER کے تحت کھدائی شروع کردی مگر ذرا دیر بعد آکر اپنے آفیسر سے کہا خندق کھودنا تو بڑا مشکل کام ہے ٹھیکہ پر دے کر کھدوالیں

پھر ہم اس میں مشق کرلیں گے۔اور یہ تو ایک واقعہ ہے کہ ۱۹۷۳ء میں جب امریکہ نے سعودی عرب کو یہ دھمکی دی کہ ہم تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرلیں گے تو تو شاہ فیصل مرحوم نے فوجیوں کا ایک گروپ پاکستان ٹریننگ کے لئے بھیجا اور کہلا بھیجا کہ ان لوگوں کو سخت سے سخت ٹریننگ دی جائے اور ان کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے ان لوگوں کی وہاں جب ٹریننگ شروع ہوئی تو کچھ روز تک یہ لوگ حکم مانتے رہے پھر کہہ دیا کہ اتنی سخت ٹریننگ ہم سے نہیں ہوسکتی، پاکستانی حکومت نے شاہ فیصل کو تفصیلات سے آگاہ کیا اور ان کی مرضی معلوم کی تو شاہ فیصل نے جواب دیا کہ ''یا تو وہ پوری ٹریننگ لے کر واپس آئیں یا پھر ان کی لاشیں یہاں آئیں گی''۔) آپ کی معلومات کے لئے یہ بھی بتاتا چلوں کہ پہلے یہاں پاکستانی فوج بڑی تعداد میں سعودی فوجیوں کو ٹریننگ دینے کے لئے موجود رہتی تھی۔کوئی خاص ٹریننگ دینا ہوتی تو پاکستان یا کسی دوسرے ملک فوجیوں کو بھیجا جاتا تھا، پاکستانی فوج کو سعودی عرب سے آہستہ آہستہ نکالنے کے بعد ہی امریکہ نے اپنے قدم یہاں جمائے ہیں۔)

جب میں وهاں گیا تو مشرق وسطی کے مشترکه دفاع کی بات چل رهی تهی ایک صاحب نے کها ان کی فوج تو برائے نام هے یه مشترکه دفاع کیا کریں گے ؟ دوسرے نے لقمه دیا اگر مشترکه دفاع پر اتفاق رائے هوگیا تو اس کا بندوبست کرنا کوئی مسئله نهیں اس کا ٹھیکه دے دیں گے ۔

میں نے سوچا جهاں تلواریں اور خنجر نیاموں میں بند هوکر ڈرائنگ روم کی زینت بن جائیں وهاں جهاد کا ٹھیکه هی دینا پڑتا هے ۔

تیسرے نے قیاس آرائی کی ویتنام یا کوریا کے نام ٹنڈر نکل آئے گا "

(جی ہاں اور ایسا ہی ہوا جب کویت اور سعودی عرب کو عراق سے جنگ کرنے کی نوبت آئی تو دونوں نے مل کر جنگ لڑنے کا ٹھیکہ دے دیا، یہ الگ بات ہے کہ امریکہ نے یہ ٹنڈر زبردستی اپنے نام کھلوالیا، ویت نام اور کوریا ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے، اور سعودی عرب کی حالت جنگ خلیج کی وجہ سے اتنی کمزور ہوگئی کہ وہاں کا بجٹ خسارے میں چلا گیا اور اسے ورلڈ بینک سے قرضہ حاصل کرنا پڑا)

❁❁❁

جامعہ کے چار سالہ تعلیمی دور کی بعض اہم علمی وثقافتی سرگرمیاں

جامعہ کے چار سالہ تعلیمی دور کی بعض اہم علمی وثقافتی سرگرمیوں اور بعض عربوں اور ندوہ سے متعلق حضرات سے ملاقات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

ایک روز ریاض کی جامع مسجد (جودیرہ میں ہے) میں مغرب کی نماز پڑھنے گیا تو سلیم الرحمٰن خان ندوی نے بتایا کہ شیخ عبداللہ بن باز کا مکان یہاں سے قریب ہی ہے، اور وہی اس مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں، ان سے ملاقات کرلی جائے، چنانچہ نماز کے بعد سلیم خاں نے شیخ بن باز سے ملاقات کروائی، تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ نابینا ہیں۔اور لباس بھی معمولی سا ہے۔جس سے ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، ہم لوگ آگے بڑھے ان سے مصافحہ کیا لیکن ملنے والوں کی کثرت تھی اس لئے ان سے کوئی بات نہیں ہوسکی، شیخ عالم اسلامی میں دینی حیثیت سے بڑی اہمیت کے حامل تھے، ۱۹۹۹ء میں ان کا انتقال ہوا، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۴ء کے دوران جب میں نے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے جامعہ سے خط وکتابت کی تھی تو اس وقت شیخ بن باز ہی ''مدینہ یونیورسٹی'' کے وائس چانسلر تھے، اور انہیں کے دستخط سے جاری کئے گئے خطوط مجھے موصول ہوئے تھے۔جب میں ریاض پہنچا تو وہ مجھ سے پہلے ہی ریاض آچکے تھے اور ''ادارۃ البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد'' کے ڈائریکٹر تھے، بعد میں اس عہدہ کو وزیر کے عہدے کے مساوی کردیا گیا۔

ایک دن سلیم الرحمٰن خاں ندوی نے ''المعهد العالی للدعوۃ الاسلامیۃ'' کی طرف سے ایک دعوت نامہ لاکر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ''المعهد العالی للدعوۃ الاسلامیۃ'' کا افتتاح ہے، اس شعبہ کا قیام چند ماہ پہلے ہی ہوا تھا اور سلیم الرحمٰن خاں ندوی اسی میں زیر تعلیم تھے، لیکن سرکاری طور پر اس کا افتتاح اب ہو رہا تھا، ولی عہد امیر فہد کی طرف سے شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ (وزیر تعلیم) اس کا افتتاح ۲۱/۵/۱۳۹۷ھ مطابق ۹/۵/۱۹۷۷ء شام سات بجے کرنے والے تھے، جلسہ کا افتتاح ہوا، اور تقریریں شروع ہوئیں، ساتھ ہی سب سے پہلے قہوے کا دور چلا پھر چائے کا دور چلا، عربی قہوہ پہلی بار یہیں چکھا، پیالی اتنی چھوٹی تھی کہ دیکھ کر ہنسی آگئی، اس میں مشکل سے ایک گھونٹ قہوہ آتا ہے، قہوہ کا رنگ دیکھا تو خاکستری، اور پیا تو مزہ پھیکا اور سیٹھا تھا، اس میں نہ شکر تھی نہ دودھ تھا، کسی طرح

اس کو ختم کیا اور دل میں خوش بھی ہوا کہ چلو تھوڑا ہی تھا ورنہ یہ کیسے ختم ہوتا، ہم ہندوستانیوں نے صرف کافی دیکھی اور پی ہے، جو اصلاً کافی کے خشک بیجوں کو بھون کر بنائی جاتی ہے، البتہ عرب ملکوں میں کافی اپنی اصلی شکل میں استعمال کی جاتی ہے، قہوے کے بیج جو مٹر کے دانے سے کچھ بڑے اور ہلکے سبز رنگ کے ہوتے ہیں، چھوٹی الائچی کے ساتھ کوٹ کر یا سالم ہی خوب ابال لئے جاتے ہیں اس میں نہ دودھ ہوتا ہے نہ شکر، یہی عربی قہوہ ہے، اور بار بار پیا جاتا ہے، بعض لوگ اس میں زعفران اور لونگ وغیرہ کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ قہوہ مقوی اور مشتہی ہوتا ہے، بھوک خوب لگاتا ہے، یہاں عموماً چائے بغیر دودھ کے پی جاتی ہے اور چھوٹے چھوٹے فنجانوں میں پی جاتی ہے، اور بار بار پی جاتی ہے، ظہران ائرپورٹ پر ہم لوگوں نے یہی چائے پی تھی جسے میں قہوہ سمجھتا رہا تھا، بعض لوگ اس میں خشک پودینہ کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں، اس سے چائے کی لذّت دوبالا ہو جاتی ہے اور رنگ ''سنہرا اور زریں'' ہو جاتا ہے، میں چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ''غبار خاطر،، پڑھ چکا تھا اس لئے یہاں کی چائے پی کر مولانا آزاد کی پھیکی اور بغیر دودھ کی چائنا کی چائے (White Jasmine) یاد آ گئی جو وہ خوب مزے لے لے کر پیتے تھے، ایک دن بطحاء بازار گیا تو وہاں چائنا کی وہائٹ جیسمن کے ڈبے پر نظر پڑ گئی، شوقِ فراواں کے ہاتھوں ڈبہ خرید لیا، اور کمرے میں آ کر بڑے اہتمام سے چائے بنائی اور پی تو محسوس ہوا کہ وہ عطر جو کپڑوں میں بسایا جاتا ہے اسے حلق کے نیچے انڈیل رہا ہوں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ چائے کی کوئی قسم نہیں ہے بلکہ چینی لوگ بعض خشک پتیوں میں چنبیلی کی خوشبو بسا کر خود بھی پیتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر کے ان کو بے وقوف بھی بناتے ہیں، جبکہ مولانا آزاد کا اصرار یہ ہے کہ اصل چائے تو چائنا کی وہائٹ جیسمن ہے باقی سب اس کی نقل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر مولانا آزاد یہاں کی چائے پی لیتے تو شاید چین کی وہائٹ جیسمن کو بھول جاتے۔

جب تقاریر کا سلسلہ ختم ہوا تو معہد کا افتتاح مرکزی عمارت میں بندھے ربن کو کاٹ کر کیا گیا، پھر رات کا کھانا ہوا، جس میں ہم لوگ بھی شریک ہوئے، کسی عربی دعوت میں شریک ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔

۲۳ جنوری ۱۹۷۸ء مطابق ۱۴ صفر ۱۳۹۸ھ بروز دوشنبہ کو مولانا علی میاںؒ ریاض تشریف لائے، ہم سب ہی ندوی طلباء ان سے ملاقات کیلئے گئے، جامعہ کے وائس چانسلر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی (اب رابطہ عالم اسلامی کے رئیس ہیں) کی دعوت پر ۲۵ جنوری بروز بدھ بعد نماز عشاء کلیۃ الشریعۃ کے

قاعة المحاضرات میں مولانا کی تقریر ہوئی، پورا ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا، خود وائس چانسلر بھی اس میں موجود تھے۔ مولانا کی دوسری تقریر ۲۶ جنوری بروز جمعرات تبلیغی مرکز ''مسجد سکرینا،، میں ہوئی، وہاں بھی عرب حضرات کا کافی مجمع تھا۔

ایک روز ایک سعودی طالب علم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے حوالے سے ملنے آیا اور کہا کہ میں ایم-اے سکنڈ ائر میں پڑھتا ہوں اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی نگرانی میں ایک مقالہ لکھ رہا ہوں، اسی سلسلہ میں انڈیا کے کتب خانوں میں مواد کی تلاش میں جا رہا ہوں، آپ لکھنؤ میں کسی کے نام ایک خط لکھ دیں تو مجھے وہاں آسانی ہو جائے گی، ان کا نام ابراھیم اللحام تھا، چنانچہ میں نے والد صاحب کے نام ایک خط لکھ کر ان کو دے دیا، میرا خط لے کر وہ ۲۴/ مارچ ۱۹۷۸ء بروز جمعہ انڈیا کے لئے روانہ ہو گئے، لکھنؤ سے پھر وہ پٹنہ ''خدا بخش'' لائبریری بھی گئے اور مختلف شہروں میں ہوتے ہوئے ۱۲/ اپریل کو ریاض واپس آ گئے، ساتھ میں والد صاحب کا خط بھی لائے۔

جامعہ میں ''مسابقة القرآن'' کا اعلان ہوا اس میں سلمان حسینی ندوی نے بھی حصہ لیا اور ان کو پہلا انعام غالباً چھ ہزار سعودی ریال کا ملا، جس کا بہترین مصرف انھوں نے یہ تلاش کیا کہ اپنے والدین کو حج کرا دیا۔ حافظ ہونے کا یہ پہلا انعام تھا جو ان کو اور ان کے والدین کو دنیا ہی میں مل گیا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح آخرت میں بھی ان کو اور ان کے والدین کو اپنے خصوصی انعامات سے نوازے۔

اپریل ہی میں مولانا واضح رشید ندوی صاحب (معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء، اور مولانا سعید الرحمان صاحب اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) بھی ندوہ کے تعارف کے سلسلہ میں ریاض تشریف لائے، کئی روز دونوں حضرات کا قیام رہا پھر یکم مئی ۱۹۷۸ء مطابق ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ کو دونوں حضرات مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

۹ دسمبر ۱۹۷۸ء مطابق ۹ محرم ۱۳۹۹ھ بروز سنیچر ڈاکٹر ہارون رشید صاحب ''شارع الریل ہاسٹل،، ہم لوگوں سے ملاقات کیلئے اچانک پہنچے، گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان کا داخلہ جامعۃ الملک سعود، ریاض (موجودہ جامعۃ الریاض) کے معهد اللغة العربية میں ہوا ہے، اور وہ بھی تعلیم ہی کی غرض سے ریاض آئے ہیں، وہ اپنے ساتھ والد صاحب کا خط اور کچھ سامان بھی ساتھ لائے تھے۔

۱۹۷۸ء کی بات ہے ایک روز جامعہ میں اعلان ہوا کہ عشاء کی نماز کے بعد ''كلية اللغة

العربیة،، کے ہال میں ترکی کی ایک مشہور علمی شخصیت ''فواد سزگین'' Fuat sezgi پروفیسر جرمن یونیورسٹی کا محاضرہ ہے، ان کا یہ محاضرہ ''تاریخ التراث العربی،، کے عنوان پر تھا، ان کی عربی تقریر میں زیادہ روانی نہیں تھی، اس لئے وہ کچھ جچے بھی نہیں، بعد میں جب ان کی علمی خدمات کا علم ہوا تو ان کی عظمت کا اندازہ ہوا، اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ جو شخص لکھنے کا مردِ میدان ہو وہ تقریر کا بھی مردِ میدان ہو، یہ کتاب کئی جلدوں میں ہے، بعد میں اسی کتاب پر ان کو فیصل ایوارڈ بھی ملا، انہوں نے یہ ساری انعامی رقم اپنی یونیورسٹی کے شعبہ طب کو دے دی، ان کا محاضرہ تاریخ التراث العربی سے متعلق ہی تھا کہ کس طرح انہوں نے اس کتاب کا مواد جمع کیا اور کس طرح اس کو مرتب کیا، اس وقت تک غالباً اس کتاب کی صرف ایک ہی جلد شائع ہوئی تھی۔

۲۳/دسمبر ۱۹۷۸ء مطابق ۲۳/محرم ۱۳۹۹ھ کو انس الہ آبادی اور سعید حسن بستوی جامعۃ الامام میں تعلیم کی غرض سے لکھنؤ سے ریاض پہنچے، تقریباً ایک ہفتہ میرے پاس علیا ہاسٹل میں قیام رہا۔ اس وقت سلمان حسینی ندوی اور نظام الدین رانچوی ندوی ''احد،، ہاسٹل میں تھے، بعد میں مجھے بھی وہیں منتقل کر دیا گیا، ان لوگوں کا داخلہ بھی کلیہ اصول الدین میں ہوا، یہ لوگ اپنے ساتھ مولانا علی میاںؒ کی تازہ کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کے چند نسخے بھی تعلق والوں کے لئے ساتھ لائے تھے، میرے کمرے کے ایک ساتھی رفیق احمد حیدرآبادی نے وہ کتاب ایک دو یوم کے وعدہ پر ان سے لے لی اور جب بھی ان سے مانگا گیا انہوں نے ٹال دیا، بالآخر بڑی مشکل سے ایک ہفتہ کے بعد وہ کتاب انہوں نے واپس کی، کتاب واپس کرنے کے بعد ہی دونوں کا عمادة شئون الطلاب کے عمید کی طرف سے بلاوا آ گیا، یہ لوگ وہاں گئے تو ان سے کہا گیا کہ سنا ہے آپ لوگ کوئی کتاب انڈیا سے لائے ہیں اور لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں، طالب بن کر رہیں کسی قسم کا کوئی پروپیگنڈہ نہ کریں۔ جائیے آئندہ احتیاط کریئے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب رفیق صاحب کی عنایت سے ہوا تھا، انہوں نے وہ کتاب عمادہ میں یہ کہہ کر پیش کی کہ اس کتاب میں مولانا علی میاںؒ نے مولانا مودودیؒ پر تنقید کی ہے، عمادہ کی اکثریت ذہنی طور پر مولانا مودودیؒ صاحب سے زیادہ متاثر تھی اس لئے انہوں نے اس کتاب کے ضروری حصے عربی میں ترجمہ کے لئے الندوة العالمية للشباب الاسلامية کو بھیج دیئے اسی لئے رفیق صاحب مطالبہ کے باوجود کتاب نہیں دے سکے تھے، جب ترجمہ آیا تو ان لوگوں کو اس میں کوئی قابل گرفت چیز نظر

نہیں آئی اسی لئے ان لوگوں نے سعید مرتضیٰ وانس الہ آبادی کو بلا کر تنبیہ کر دی کہ آئندہ کوئی کتاب لا کر تقسیم نہ کریں، دونوں نے یہ ساری بات ہم ندویوں کو بتائی، مجھے رفیق صاحب کی اس حرکت پر بڑا تعجب ہوا کیونکہ وہ میرے کمرے کے ساتھی تھے، ان سے اکثر مختلف جماعتوں تحریکوں اور اداروں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی تھی لیکن انہوں نے مجھے کبھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیا کہ ان کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔ ظاہر ہے انہوں نے ایسا قصداً کیا ہوگا، یہاں میرے پاس چھپانے کی کوئی چیز نہیں تھی، میں جو کچھ باہر سے تھا وہی اندر سے بھی تھا مگر وہ تقیہ کئے بیٹھے تھے، ان کی اس حرکت کے بعد ہی مجھے ان کے جماعت اسلامی سے متعلق ہونے کا علم ہوا، اور ان کی اس حرکت پر افسوس بھی ہوا۔

اس واقعہ کے تقریباً ایک ماہ کے بعد ۲۷/جنوری ۱۹۷۹ء مطابق ۲۹/صفر ۱۳۹۹ھ کو مولانا علی میاںؒ اور مولانا رابع صاحب حسنی ندوی (ناظم ندوة العلماء) اور حمزہ حسنی ندوی صاحب (ناظر عام ندوة العلماء) ریاض آئے، ان لوگوں کا ائرپورٹ کے قریب ہی ہوٹل "فندق البستان،، میں قیام رہا۔ ہم لوگ جب ملاقات کے لئے گئے تو اس واقعہ کا تذکرہ مولانا علی میاں مرحوم سے کیا تو مولانا نے برجستہ فرمایا ''ان سے کہنا کہ اب ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے یہ کتاب عربی زبان میں بھی آ رہی ہے اسے خوب غور سے پڑھیں''۔ پھر دو روز قیام کے بعد تینوں حضرات ۳۰/جنوری مطابق ۲/ربیع الاول ۱۳۹۹ھ کو مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

شارع الریل ہاسٹل میں ہم لوگوں نے ایک بزم کی تشکیل کی جس میں عرب، غیر عرب سب شامل تھے، اس کا نام غالباً ''بزم اقبال،، رکھا گیا تھا، پہلے جلسہ میں مقالہ پڑھنے کے لئے رفیق حیدرآبادی کا انتخاب ہوا، موضوع غالباً ''ہندوستان میں اسلام کی تاریخ اور اس کا مستقبل،، تھا۔ اس موضوع پر میں بڑا خوش ہوا کہ اس سے ہمارے عرب ساتھی ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے متعارف ہو جائیں گے، لیکن مقررہ تاریخ پر جب جلسہ ہوا اور رفیق صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا تو ہم سب ہندوستانیوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوستان میں اسلام کی اپنی کوئی تاریخ ہی نہیں اور نہ وہاں اسلام کے لئے مسلمانوں یا وہاں کے بادشاہوں نے کچھ کیا ہے، وہاں اسلام کی جو کچھ خدمت ہوئی ہے وہ سب جماعت اسلامی کے قیام کے بعد ہی ہوئی ہے اور ساری خدمات مولانا مودودیؒ کی مرہون منت ہیں۔

ایک بات رہ گئی کہ جب جامعہ میں ماہ جولائی ۱۹۷۸ءکو سالانہ تعطیل کا اعلان ہوا تو ہم لوگوں نے ٹکٹ براہ کراچی دہلی، لکھنؤ کا بنوایا کیونکہ ان ہی دنوں میں کراچی میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے پہلی ''ایشیائی کانفرنس'' ۶/ جولائی سے ہو رہی تھی اور اس میں مولانا علی میاں اور ندوہ کے دیگر علماء کے آنے کی توقع تھی، چنانچہ ۶/جولائی ۱۹۷۸ء کو ہم لوگ (راقم سطور، سلمان الحسینی اور نظام الدین رانچوی) کراچی روانہ ہوگئے، چونکہ ہم لوگ ٹرانزیٹ مسافر تھے اس لئے ائر لائن والوں نے اسٹار گیٹ پر ''ہوٹل ڈی فرانس'' میں ٹھہرایا، دوسرے دن ہم لوگ ہوٹل سے بنوری ٹاؤن قاری رشید الحسن صاحب کے پاس گئے، جمعہ کی نماز ان ہی کی مسجد میں پڑھی وہیں بعد نماز جمعہ مولانا علی میاں ندویؒ، مولانا منظور نعمانیؒ، مولانا معین اللہ ندویؒ، مولانا اسحاق جلیسؒ ندوی، مولانا محمد میاں حسنی، خلیل الرحمٰن سجاد ندوی اور حکیم حافظ احمد علی ندوی سے ملاقات ہوئی۔

وہیں سے کانفرنس کی گاڑی پر ہوٹل پہنچے، اسی دن ۶/ بجے شام کو دہلی کے لئے انڈین ائر لائن کی فلائٹ میں سیٹ OK تھی مگر ٹکٹ پر ٹائم کے غلط اندراج کی وجہ سے ہم لوگ ائر پورٹ تاخیر سے پہونچے اور دہلی کی فلائٹ چھوٹ گئی، مجبوراً ایک روز مزید ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا، ٹرانزیٹ مسافر ہونے کی وجہ سے سامان انڈین ائر لائن سے دہلی جا چکا تھا اس لئے اسی وقت میں نے ائر لائن کے ذریعہ دہلی ائر پورٹ پر ٹیلی گرام سے پیغام Massage بھجوادیا کہ فلاں فلاں نام کے سوٹ کیس علیحدہ رکھ لئے جائیں ہم لوگ کسی دوسری فلائٹ سے دہلی پہونچیں گے، پھر ۸/ جولائی کو PIA سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی، دہلی پہونچ کر ضابطہ کی کارروائی کے بعد سامان ملا، رات دہلی ائر پورٹ پر گذری اور ۹ کی صبح ۶/ بجے کی فلائٹ سے لکھنؤ روانگی ہوئی۔

۱۹۷۹ء میں جب میں علیا ہاسٹل میں مقیم تھا ہندوستان سے عنایت اللہ سبحانی صاحب بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے آکر مقیم ہوئے، ان کے آتے ہی ہاسٹل میں جداری اخبار کا سلسلہ شروع ہوگیا، ناموں کو دیکھ کر میں بڑا خوش ہوا کہ اپنے ہندوستانی بھائیوں نے سبقت کی، لیکن جب دارالعلوم دیوبند سے متعلق مضمون پڑھا تو بڑی مایوسی ہوئی، اس میں دارالعلوم دیوبند کا تعارف کم، ہجو زیادہ تھی، جب بھی جداری اخبار نکلتا ایک نظر اس پر ڈالتا اور ہر بار مجھے مایوسی ہوتی، سننے میں آیا کہ جداری اخبار عنایت سبحانی صاحب کی عنایت سے نکلتا تھا۔ خیر سے ان کا تعلق بھی جماعت اسلامی سے تھا۔

۲۵/فروری ۱۹۷۹ء بروز منگل کو ڈاکٹر اشتیاق صاحب قریشی اور مولانا شمس الحق صاحب ندوی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی کتابوں کے تعارف کے لئے ریاض پہنچے، ان حضرات کو ریاض یونیورسٹی کی جانب سے ہونے والی کتابوں کی انٹرنیشنل نمائش میں شرکت کرنا تھی، نمائش میں اور نمائش کے باہر بھی ان حضرات سے ملاقات رہی، نمائش ختم ہونے کے بعد ان لوگوں کا عمرہ کے لئے جانے کا پروگرام بنا تو میں نے بھی عمرہ کا ارادہ کرلیا کیونکہ ان دنوں جامعہ میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، مجھے اپنے پاسپورٹ کی تجدید بھی کرانا تھی، ہندوستانی سفارت خانہ اس وقت تک ریاض منتقل نہیں ہوا تھا، آخر ۶/ مارچ ۱۹۷۹ء بروز بدھ ہم تینوں فلائٹ سے جدہ کے لئے روانہ ہوئے، جدہ ائر پورٹ پر بشیر صاحب انجینئر اور پروفیسر عباد الرحمٰن نشاط صاحب (پروفیسر کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی) کے علاوہ اور بھی کئی حضرات استقبال کے لئے موجود تھے۔ رات ڈاکٹر عباد الرحمٰن نشاط صاحب کے گھر پر گزری، ۷/مارچ ۱۹۷۹ء کو بعد نماز عصر ضیاء عبداللہ اور بشیر صاحب انجینئر کے ساتھ مکہ مکرمہ روانگی ہوئی، بعد نماز مغرب سب نے عمرہ کیا، ۱۰/ مارچ کی صبح میں تنہا مدینہ منورہ گیا، حرم مدنی میں طارق حسن عسکری صاحب سے ملاقات ہوگئی تو وہ اپنے گھر اصرار کرکے لے گئے۔ ۱۲/ مارچ کو میں مکہ مکرمہ واپس پہنچا۔

۱۳/ اور ۱۴/ مارچ ۱۹۷۹ء کی رات میں مکہ مکرمہ میں تھا کہ سعودی عرب میں پہلی بار میرے سامنے چاند گرہن ہوا، میں کمرے کے اندر تھا کہ اچانک محسوس ہوا کہ مسجد حرام سے قرآن پاک پڑھنے کی آواز آرہی ہے میں وجہ جاننے کے لئے باہر نکلا تو چاند گہنایا ہوا نظر آیا، فوراً لپک کر میں بھی حرم میں آیا اور نماز میں شامل ہوگیا۔

۱۴/ مارچ فجر کی نماز کے بعد ہم تینوں جدہ گئے، شام کو مولانا شمس الحق صاحب ندوی شیخ عبداللہ بن باز سے بعض حضرات کے نام خطوط لینے کی غرض سے مکرمہ جانے لگے تو مجھ سے بھی چلنے کے لئے کہا، ہم دونوں ضیاء عبداللہ عباس کی گاڑی سے مکہ مکرمہ آئے، رات انہیں کے گھر قیام رہا، اور ۱۲/ مارچ کی صبح ضیاء عبداللہ عباس کے ساتھ جدہ واپس آئے، پھر ۱۷/ مارچ کی شام کو میں تنہا فلائٹ سے ریاض واپس آگیا، اور یہ دونوں حضرات غالباً ایک ہفتہ کے بعد مکہ مکرمہ سے ریاض واپس آئے اور ۲۵/ مارچ کو ظہران کے لئے روانہ ہوگئے۔

۲/اپریل ۱۹۷۹ء مطابق ۵ جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ بروز اتوار مولانا اجتباء صاحب ندوی

لکچرار جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی (بعد میں جامعۃ الامام اور مدینہ یونیورسٹی میں بھی استاد رہے) اپنے ایک رفیق سفر کے ساتھ ریاض آئے تو ملاقات کے لئے ہم لوگوں کے پاس علیا ہاسٹل چلے آئے، ان لوگوں سے متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں، ایک شام کو چھوٹا موٹا جلسہ بھی ان کے اعزاز میں ہاسٹل کے مشرف سے مل کر ہاسٹل ہی میں کیا گیا، جس میں بعض فلسطینی لڑکوں نے اور مولانا نے تقریر کی اور چائے ولوازمات پر جلسہ کا اختتام ہوا۔ پھر ۱۱/اپریل کو مولانا اپنے رفیق سفر کے ساتھ ظہران روانہ ہوگئے۔

۲۰/اپریل ۱۹۷۹ء بروز جمعہ قمر علی ندوی صاحب (سابق منیجر مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، حال مقیم دبی) کویت ہوتے ہوئے ریاض پہنچے، ان سے گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' نے دارالافتاء ریاض کے لئے بہت سی کتابیں بھیجی ہیں اور وہ بذریعہ بحری جہاز دمام بندرگاہ پہونچ رہی ہیں، ان کتابوں کو بندرگاہ سے چھڑا کر ریاض میں ''دارالافتاء'' کے حوالہ کرنا ہے، انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ میرے ایک عزیز دمام میں رہتے ہیں تو انہوں نے مجھ سے دمام چلنے کی فرمائش کی، مجھے تردد ہوا کہ میرے جانے سے مجلس کا پیسہ دوگنا خرچ ہوجائے گا، لیکن انکا اصرار ہوا کہ آپ کے نہ ہونے سے انجانے میں اس سے کہیں زیادہ پیسہ خرچ ہونے کا اندیشہ ہے، جتنا آپ کے کرایہ میں خرچ ہوگا، اس لئے آپ ضرور ساتھ چلیں، چنانچہ ہم دونوں ۸/مئی ۱۹۷۹ء بروز منگل شام کو ۶/۳۰ کی فلائٹ سے ظہران گئے، میرے عزیز فضل الٰہی واعظی ساکن ٹیلہ شاہ پیر محمد لکھنؤ (حال مقیم مکہ مکرمہ) جو جج میں میرے ساتھ تھے ایک ایسی کمپنی میں تھے جو بندرگاہ سے مال بھی چھڑاتی تھی اور اپنے ٹرک سے مطلوبہ جگہ پہونچا بھی دیتی تھی، فضل بھائی کے ساتھ ہم لوگوں نے کمپنی کے منیجر سے گفتگو کی تو انہوں نے ایک دینی اشاعتی ادارہ ہونے کی وجہ سے کم سے کم چارجز وصول کرنے کا وعدہ کیا، سارے کاغذات ان کے سپرد کر کے ہم لوگ فضل بھائی کے بڑے بھائی فضل حق صاحب سے ملنے **الخبر** آئے، شام کو خبر ملی کہ کتابیں آئے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے اس لئے اس پر ہزاروں ریال جرمانہ ادا کرنا ہوگا، کمپنی کے منیجر سے ہم لوگوں کی دوبارہ گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ لوگ پریشان نہ ہوں، چونکہ کتابیں دینی ہیں اور ایک دینی ادارہ کی ہیں اس لئے ہم انشاء اللہ کوشش کر کے جرمانہ معاف کرالیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، انہوں نے مختلف قسم کے کاغذات تیار کرائے اور دینی کتابوں کا حوالہ دے کر جرمانہ معاف کرالیا، مزید ضروری کارروائی کر کے ہم دونوں ۱۲/مئی بروز سنیچر دوپہر ۱۱/بجے کی فلائٹ سے ریاض واپس آ گئے۔

دن اور وقت مقررہ پر کتابوں کا ٹریلر (یہ بہت بڑا ٹرک ہوتا ہے جس میں ۱۶ پہیئے لگے ہوتے ہیں) دمام سے ریاض کے ''دارالافتاء'' پہنچ گیا، ہم دونوں وہاں پہلے سے موجود تھے، قمر صاحب بطحاء جا کر پاکستانی مزدور لائے تو وہ بڑے بڑے بہت سے بنڈل دیکھ کر واپس چلے گئے، قمر صاحب دوبارہ بطحاء گئے اور یمنی مزدور جا کر لائے تو انہوں نے ٹرک سے کتابیں اتاریں، ہم لوگوں نے کتابیں دارالافتاء کے ذمہ داروں کے سپرد کیں، ان سے دستخط لئے اور اپنی رہائش گاہ واپس آ گئے۔

۲۳/مئی ۱۹۷۹ء مطابق ۲۷/ جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ بروز بدھ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ (استاد کلیۃ اصول الدین، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ) مولانا علی میاںؒ ندوی کی کوششوں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے استاد زائر کی حیثیت سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے، ان کے ہاتھ میں نے والد صاحب کو خط وغیرہ بھی بھجوایا، شیخ کے ندوہ میں متعدد محاضرے ہوئے اور طلباء واساتذہ ان سے مستفید ہوئے۔

۲۹/ مارچ ۱۹۸۰ء کو قمر علی ندوی وزارۃ الدفاع میں ملازم ہو کر ریاض آ گئے، مجلس تحقیقات ونشریات سے پھر کچھ کتابیں دمام سمندری راستہ سے آئی تھیں، قمر صاحب نے مجھ سے کہا کہ چونکہ اب میں یہاں ملازمت کر رہا ہوں اس لئے میں نہیں جاسکتا، اس لئے تم ہی چلے جاؤ، چنانچہ ۱۷/اپریل ۱۹۸۰ء کو میں صبح ۸/۴۵ والی فلائٹ سے ظہران گیا، فضل بھائی کے پاس قیام رہا، انہیں کی کمپنی کے ذریعہ ضروری کارروائی مکمل کروائی اور ۲۰/اپریل ۱۹۸۰ء کو دوپہر ۱/۴۰ والی فلائٹ سے ریاض واپس آ گیا۔ ۲۴/اپریل کو دوبارہ اسی سلسلہ میں پھر فلائٹ سے ظہران جانا پڑا اور ۲۶/کی صبح کو ریاض واپسی ہوئی۔

اس چار سالہ تعلیمی دور میں جامعہ کی طرف سے متعدد سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور متعدد ہفتے منائے گئے، مثلاً اسبوع الفقہ الاسلامی الخامس، مؤتمر العلماء الجغرافیيون، اسبوع محمد بن عبدالوهاب، اسبوع الامام ابن تيمية وغیرہ۔ مؤتمر العلماء الجغرافیيون" اور "اسبوع الفقه الاسلامی الخامس" میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا جو انٹر کانٹینینٹل ہوٹل میں ہوئی تھی، مؤتمر کی تفصیلات تو اب ذہن میں نہیں ہیں صرف اتنا یاد ہے کہ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے ہندوستان سے شمیم احمد مدنی بھی آئے تھے، کانفرنس میں میرا اور ان کا کافی ساتھ رہا، اس موقع پر جامعہ نے ایک قدیم مخطوطہ ''وصف افریقیا''، چھپوا کر تمام شرکائے کانفرنس میں تقسیم کروایا۔

میں "اسبوع الفقه الاسلامي" کے صرف افتتاحی اجلاس میں میں شریک ہوا، یہ جامعۃ الامام محمد بن سعود کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا، اس سے پہلے چار ہفتے مختلف ملکوں میں منائے جا چکے تھے، اس کا افتتاحی جلسہ "انٹر کانٹیننٹل" ہوٹل کے "ملک فیصل ہال" میں منعقد ہوا تھا، اس بارے میں کچھ باتیں ڈائری میں لکھی مل گئی ہیں وہی پیش خدمت ہیں:

ذی قعدہ کی ۲۵/ تاریخ تھی، چار بجے سہ پہر میں بھی ہوٹل پہونچ گیا، جیسے ہی ہال میں داخل ہوا اسٹیج کے عقب میں بنے ہوئے سعودی عرب کے مونوگرام پر نگاہ ٹھہر گئی، مندوبین اور سامعین سب پہنچ چکے تھے البتہ کرسی صدارت ہنوز خالی پڑی تھی، میں اس عظیم ہال اور اس کی آرائش وزیبائش پر ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ اسٹیج کے قریب کا وہ خفیہ دروازہ کھلا جو دور سے دیوار ہی کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا، سب سے آگے امیر سلمان بن عبدالعزیز (گورنر ریاض) تھے جو ولی عہد فہد بن عبدالعزیز اور نائب مجلس وزراء کی طرف سے اس کانفرنس کا افتتاح کرنے آئے تھے، ان کے ساتھ ہی ہماری جامعہ کے وائس چانسلر شیخ عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی، شیخ عبدہ یمانی (وزیر اعلام) اور احمد عز الدین عبداللہ تھے جو قاہرہ کی "المجلس الاعلى لرعاية الفنون والآداب والعلوم الاسلامية" کے سکریٹری ہیں اور اسی مجلس کے اشتراک سے یہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔

دیار غیر میں ایک تو اپنوں سے دوری یوں ہی انسان کو بیکل بنائے رہتی ہے، ایسی صورت میں اگر کسی عزیز کا انتقال ہو جائے تو انسان اور زیادہ حساس اور بیچین ہو جاتا ہے ۱۹۷۹ء میں صرف چند ماہ کے عرصہ میں کئی عزیزوں، تعلق والوں اور ندوہ سے متعلق افراد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے کافی دنوں تک طبیعت افسردہ اور پریشان رہی۔

۲۲/ اپریل ۱۹۷۹ء کو میرے ہم زلف سید قائم رضاؒ کا بعارضہ ٹیٹنس کانپور کے ہیلٹ اسپتال میں انتقال ہوا، ۲۸/ اپریل کو والد صاحب کے پھوپھا سید امتیاز علی وارثیؒ کا پاکستان میں انتقال ہوا، ۱۳/ جون کو ندوہ کے مولانا محمد میاں حسنیؒ ایڈیٹر البعث الاسلامی کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوا، ۱۲/ جولائی کو مولانا محمد اسحاق خاں ندوی ایڈیٹر تعمیر حیات کا انتقال ہوا، ۲۴/ اگست کو مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) کا انتقال ہوا۔

اللهم اغفر لهم وارحمهم وأدخلهم فسيح جناتك، واجزل عليهم شآبيب رحمتك.

سفر ہفوف

ریاض کے چار سالہ تعلیمی قیام کے دوران مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، اور جدہ کے علاوہ بہت کم ہی کسی دوسرے شہر جانے کا اتفاق ہوا ہے حتیٰ کہ مضافات ریاض میں بھی دو تین بار سے زائد نہیں جا سکا، یونیورسٹی کے ٹور پروگرام کے تحت مضافات ریاض مثلاً درعیہ، سلبوخ اور الخرج وغیرہ جانا ہوا اور کئی بار ذاتی طور پر اور "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ" کے کام سے ظہران، دمام اور الخبر جانا ہوا، ذاتی طور پر بنائے گئے پروگرام کے تحت "ہفوف" اور مضافات ہفوف کے تاریخی مقامات اور آثار قدیمہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، خاص طور پر ہفوف کے عجیب وغریب پہاڑوں اور غاروں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی لامحدود حکمت وصناعی اور لازوال کمال وقدرت کے آگے انسانی ذہن حیران وششدر رہ جاتا ہے، جس نے عجیب وغریب قسم کے یہ پہاڑ بنائے ہیں۔

ہفوف کا سفر ایک یادگار سفر تھا اور جو کچھ اس سفر میں دیکھا، وہ اللہ تعالیٰ کے عجائبات قدرت کی حیرت انگیز نشانیاں تھیں اس لئے خیال ہوا کہ آپ کو بھی ان قدرتی عجائبات اور تاریخی مقامات کی سیر کرادوں اگر چہ فارسی کا مقولہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" ایک زندہ حقیقت ہے۔

جمعہ کا دن تھا مولانا محمد اجتباء حسینی ندوی صاحب (سابق پروفیسر مدینہ یونیورسٹی و جامعۃ الامام محمد یونیورسٹی ریاض، و جامعہ ملیہ اسلامیہ، والہ آباد یونیورسٹی) کے گھر ملاقات کے لئے پہنچا تو دستر خوان لگا ہوا تھا اور میرے کچھ بے تکلف ساتھی بھی کھانے پر موجود تھے، مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی، یکایک کسی گوشہ سے سفر کی باتوں کی بھنک میرے کانوں میں پڑی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قمر علی صاحب ندوی اور سعید حسن بستوی ندوی ہفوف جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں اور میزبان کی حیثیت سے محمد اسامہ بستوی کا انتخاب ہوا ہے۔ محمد اسامہ جب عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے میرے پاس ریاض ٹھہرے تھے تو ان کے اصرار پر میں نے ان سے ہفوف آنے کا وعدہ کر لیا تھا، چنانچہ ان دونوں کے ساتھ میں بھی اس پروگرام میں شامل ہو گیا اور سفر کے وقت اس میں مزید ایک چوتھے ساتھی کا اضافہ ہو گیا۔ سفر جمعرات کے دن ٹرین سے جانے کا طے ہوا، اس ٹرین سے جس کی دوڑ صرف ریاض سے دمام تک ہے بس! اگر آپ وہاں کا اسٹیشن دیکھیں تو اسے کسی دور افتادہ دیہات کا اسٹیشن سمجھیں اور اگر ریلوے لائن پر ایک نظر ڈالیں تو اسے منجملہ آثار قدیمہ محسوس کریں۔ لیکن اگر اندر

سے دیکھیں تو اس کے سامنے انڈیا کی ٹرینیں مات نظر آئیں۔ پوری ٹرین ایر کنڈیشنڈ، قالین سے مزین، کھڑکیوں پر بڑے بڑے شیشوں پر سبز رنگ کے دوہرے پردے پڑے ہوئے، فام کی بہترین آرام دہ سیٹیں، بوقت ضرورت ان کا رخ جدھر چاہیں ادھر کرلیں، ڈبے کے اندر نہ کوئی شور وغل، نہ کوئی ہنگامہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ نماز کے لئے ایک خاص جگہ مقرر، اور نماز کے لئے الگ ایک قالین بچھی ہوئی۔

خدا خدا کر کے جمعرات کا دن آیا، اسامہ کو فون سے آمد کی اطلاع کی گئی تا کہ پیشوائی کے لئے وہ اسٹیشن پر موجود رہیں، چار افراد کا یہ مختصر سا قافلہ ۲ بجے دوپہر کو ریاض اسٹیشن پہنچ گیا، ٹرین آئی، آنکھوں نے دیکھا مگر کان اس کی آمد سے بے خبر رہے، ڈھائی بجے، اور ٹرین روانہ ہوگئی، نہ کانوں کو سیٹی کی آواز سنائی دی اور نہ آنکھوں کو سگنل یا سبز جھنڈی نظر آئی، کتنے ہی اسٹیشن آئے مگر دیکھنے اور سننے کی کوشش کے باوجود نہ کوئی اسٹیشن دکھائی دیا اور نہ سنائی دیا، اس لئے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "ہفوف" آئے اور گذر بھی جائے اور ہم لوگوں کو خبر بھی نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوا، لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ہر اسٹیشن سے پہلے جہاں ٹرین کو رکنا ہوتا ہے ٹی ٹی آتا ہے اور اُس اسٹیشن پر اترنے والوں سے ٹکٹ لے لیتا ہے، اب آپ اترنے کیلئے تیار ہو جائیں اور بے فکر ہو کر اسٹیشن پر اتر جائیں، یہاں آپ سے کوئی شخص نہ ٹکٹ طلب کرے گا اور نہ یہ پوچھے گا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، ہاں لیکن اترتے وقت یہ یاد کرلیں کہ آپ کے ساتھ کوئی وزنی سامان یا بکس وغیرہ تو نہیں تھا، اگر تھا تو آپ اس کیبن تک جائیں جو سامان رکھنے کے لئے مخصوص ہے اور ٹوکن دکھا کر اپنا سامان لے لیں۔ آپ پچاس کلو تک وزن کا سامان بغیر کسی چارج کے لے جا سکتے ہیں۔ ٹرین پر سامان لادنے اور اتارنے کی ذمہ داری اسٹیشن کے عملہ کی ہے، قلیوں کی چیخ و پکار اور ان سے دھینگا مشتی کرنے کا کوئی سوال نہیں۔ ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا، اگر آپ کو ٹرین میں سوار ہونے کے بعد کوئی ضروری کام یاد آ گیا یا آپ کسی تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کیلئے ٹرین میں ٹیلیفون بھی حاضر ہے، متعینہ سکہ اس میں ڈالئے اور بات کیجئے۔

تقریباً پانچ گھنٹے بعد جب ہفوف قریب آیا تو اچانک ٹی ٹی نمودار ہوا، اور جن لوگوں کو ہفوف اترنا تھا ان سے ٹکٹ لے لیا، سفر آرام دہ اور پرسکون رہا، تقریبا آٹھ بجے رات کو ٹرین ہفوف پہنچی، گاڑی رکی اور ہم لوگ اسٹیشن پر اتر گئے، اسامہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسٹیشن پر موجود تھے، ان ہی کی رہنمائی میں قیام گاہ پہنچے کھانا وغیرہ سے فارغ ہوئے، پھر جمعہ کی نماز کے بعد ''القارہ پہاڑ'' اور ''مسجد جواثی'' اور پانی کا چشمہ ''عین النجم'' اور دیگر سرسبز مقامات دیکھنے کا پروگرام بنا اور پھر ہم سب لمبی تان کر سو گئے۔

صبح اٹھ کر ناشتہ وغیرہ سے فراغت کے بعد ٹہلتے ہوئے شہر نکل گئے، رات میں تو شہر دیکھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا لیکن اب دن کی روشنی میں شہر کو دیکھنا اور سمجھنا آسان تھا۔ ہفوف شہر میں ابھی نئی تہذیب وتمدن اور اس کے لوازمات اتنے زیادہ دخیل نہیں معلوم ہوتے جتنے، ریاض، دمام، خبر، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ عمارتیں عموماً پرانی اور مٹی کی نظر آتی ہیں، اور ان سے عربی طرز تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے، نئی عمارتیں بھی پرانی عمارتوں کے دوش بہ دوش موجود ہیں لیکن کم ہیں، اور زیادہ بلند بھی نہیں ہیں، شہر کے بعض علاقوں پر لکھنؤ کی بعض گلیوں اور کوچوں کا گمان ہوتا ہے، اسی لئے جب رات میں ہم لوگ کھانے کے بعد چہل قدمی کے لئے نکلے تھے اور پان چباتے ہوئے وہاں کی گلیوں اور بازاروں میں داخل ہوئے تھے تو کسی نے کچھ حصہ کو احاطہ شوکت علی سے تشبیہ دی تھی اور کسی نے کچھ حصہ کو امین آباد کہنے پر اصرار کیا تھا، اور کسی نے بعض حصے کو چوک اور نخاس سے مشابہ قرار دیا تھا۔

یہ شہر سعودی عرب کا ایک بہت بڑا نخلستان ہے اور بہت زیادہ سرسبز وشاداب ہے، یہ کھجوروں کا بہت بڑا مرکز بھی ہے، پختہ نہروں اور نالیوں کے ذریعہ باغات تک پانی پہنچانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے کھجوروں کے باغات ہی باغات نظر آتے ہیں اور دل میں پہلی بار کسی عرب ملک کے نخلستان میں ہونے کا احساس شدت سے جاگتا ہے

میں تنہا چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

نماز جمعہ کے بعد بارہ آدمیوں کا قافلہ بذریعہ کار روانہ ہوا، ہماری پہلی منزل چھ سات کیلومیٹر دور ''قارہ'' کا پہاڑی سلسلہ تھا جس کے عجیب وغریب غار دور دور تک مشہور ہیں، جیسے ہی ان پہاڑوں پر نظر پڑی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں سفید رنگ کے پہاڑ پہلی بار نظر سے گذر رہے تھے، خاکی رنگ کے، سرخ رنگ کے، کتھئی رنگ کے اور سیاہ رنگ کے پہاڑ تو ریاض سے مدینہ منورہ اور مدینہ سے مکہ مکرمہ وجدہ کے راستوں میں کثرت سے نظر آئے تھے لیکن یہ پہاڑ تو بالکل سفید تھے جو دور سے ہلکے سرخی مائل نظر آرہے تھے، ان پہاڑوں میں بہت سے غار ہیں جن کو دیکھنے دور دور سے، حتی کہ یورپین ممالک کے سیاح بھی آتے ہیں۔ ان پہاڑوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان پہاڑوں کی تاریخ بہت پرانی ہے کیونکہ اب یہ آہستہ آہستہ بھُر بھُرے ہو کر گرتے جا رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ آپ نے ہاتھ لگایا اور وہ نیچے گرا لیکن ایسا نہیں ہے ان کے گرنے کیلئے شاید ابھی صدیاں درکار ہوں، ان پہاڑوں کا بعض

حصہ کہیں کہیں سے اس طور پر گرا ہے کہ ان پر کئی کئی منزلہ بغیر چھت کی غلام گردش ہونے کا گمان ہوتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ کبھی یہ بھی آباد رہے ہوں گے، غاروں کے بعض حصے بہت زیادہ تنگ ہیں اور بعض حصے بہت زیادہ کشادہ ہیں، کشادہ حصے عموماً چوٹی تک کھو کھلے ہیں اور چوٹی پر روشن دان جیسی شکل میں ڈھل گئے ہیں، لیکن اوپر سے ان روشن دانوں کی جگہوں کی نشان دہی کرنا تقریباً ناممکن ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ غار خود بخود نہیں بن گئے ہیں بلکہ ان کو ماقبل تاریخ کسی زمانے میں انسانی ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے۔ بعض بڑی بڑی چٹانیں تو اتنی مسطح اور برابر ہیں کہ ان پر ڈھلی ہوئی دیوار کا شبہ ہوتا ہے، بعض حصے نیچے سے چوٹی تک بالکل کھو کھلے ہیں، اور گنبد کی طرح گول ہیں، بعض حصے بالکل تاریک ہیں، غاروں کے اندر بعض قدرتی راستے ایسے ہیں، جو چوٹی تک پہنچاتے ہیں، پانی کا ایک چشمہ بھی ہے، جسے کسی مصلحت سے اب بند کر دیا گیا ہے، ان پہاڑوں اور غاروں کو دیکھنے کے بعد مجھے جغرافیہ کی کتابوں کے دیکھنے کا شوق ہوا کہ اگر واقعی یہ پہاڑ اور غار اپنی کوئی تاریخ رکھتے ہیں تو ان کا تذکرہ جغرافیہ کی کتابوں میں ضرور ملے گا، چنانچہ محمد بن عبداللہ بلیہد کی عربی کتاب **صحیح الاخبار عما فی بلاد العرب من الآثار** میرے ہاتھ لگ گئی ''جبل القارۃ'' سے متعلق مضمون پڑھا تو ان پہاڑوں اور غاروں کی ایک نئی خصوصیت کا اس سے انکشاف ہوا، کتاب کے صفحہ نمبر ۱۶۴ / جلد چہارم میں وہ لکھتے ہیں: ''قارّہ'' کے پہاڑوں کے غار سخت سردیوں میں تنور کی طرح گرم اور سخت گرمیوں میں برف کی طرح ٹھنڈے رہتے ہیں''۔

ان غاروں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے لامحدود کمال وقدرت کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے، جس نے یہ عجیب وغریب پہاڑ اور غار بنائے ہیں، کون ہوگا جو ان پہاڑوں کی کیفیت وعظمت اور غاروں کی ندرت ووسعت کو دیکھتے ہوئے بھی خدا کی قدرت وعظمت اور خالقیت وقیومیت کا انکار کرے گا۔ غالباً اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی خالقیت ووحدانیت کے لئے جہاں اور چیزوں کو بطور ثبوت پیش کیا ہے اور ان پر غور وفکر کی دعوت دی ہے وہیں جابجا پہاڑوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے'' **أفلا ینظرون إلیٰ الابل کیف خلقت والیٰ السماء کیف رفعت والیٰ الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت '' (سورہ الغاشیہ : ۱۷: تا ۲۰)**

ترجمہ: کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا، اور آسمان کی طرف کہ کیسے بلند کیا گیا، اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے نصب کئے گئے اور زمین کی طرف کہ کیسے برابر کی گئی۔

''جبل القارّہ'' کے بعد ہم لوگ مسجد ''جواثی'' گئے جو شہر سے تقریباً ۲۰ / ۲۵ / کیلومیٹر دور ہے،

یہ وہ مسجد ہے جس میں وفد بنی قیس نے مدینہ منورہ سے واپسی میں اسلام کی دوسری نماز جمعہ ادا کی تھی۔ مسجد بہت چھوٹی ہے، اور صرف محرابیں باقی رہ گئیں ہیں، اور اب اس چھوٹی مسجد کو ایک بڑی مسجد کے اندر سمو دیا گیا ہے۔ اصل مسجد کے اوپر الگ سے ایک سائبان بنا دیا گیا ہے، بلکہ یوں سمجھ لیں کہ سابقہ قدیم مسجد اب ایک نئی مسجد کے اندر آ گئی ہے مگر پرانی مسجد کی محرابیں اب بھی اپنی حالت میں موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئی مسجد بننے سے پہلے تک اس کی مرمت ہوتی رہی ہے، اس مسجد کا تذکرہ صحیح بخاری میں ''وفد بنی قیس'' کے ذکر کے ساتھ آیا ہے۔ فتح الباری صفحہ ۳۶ جلد ۲ میں ہے:'' **عن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قال اول جمعۃ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ ﷺ فی مسجد عبد القیس بجواثی**''

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ پہلا جمعہ جو مسجد نبوی کے جمعہ کے بعد پڑھا گیا وہ عبدالقیس کی مسجد جواثی میں پڑھا گیا۔

مسجد کے آس پاس پارک سے بنا دیئے گئے ہیں، جن کی سینچائی ٹیوب ویل سے ہوتی ہے لوگ عموماً جمعرات جمعہ کی چھٹی میں یہاں آ جاتے ہیں اور پارکوں کی سرسبزی وشادابی سے محظوظ ہوتے ہیں، ہم لوگ بھی ایک قریبی پارک میں رک گئے، یہیں کھانا کھایا اور دس پندرہ منٹ آرام کر کے 'مسجد جواثی'' میں عصر کی نماز پڑھی اور چشمہ ''النجم'' کی طرف روانہ ہو گئے، اس چشمہ کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ کس کی طرف منسوب ہے؟ کچھ معلوم نہ ہو سکا، اس کے بارے میں مشہور ہے کہ جو مریض بھی اس میں غسل کرتا ہے شفایاب ہو جاتا ہے یہ کہاں تک صحیح ہے یہ خدا ہی جانے، ہو سکتا ہے کہ اس کے پانی میں بعض ایسے کیمیائی اجزاء (مثلاً گندھک وغیرہ) شامل ہوں جو جلدی امراض کے مریضوں کو ٹھیک کر دیتے ہیں اس لئے لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ اس کے پانی میں غسل کرنے والے ہر مریض کو شفا ہو جاتی ہے۔ اس چشمہ کا پانی دوسرے چشموں کے پانی کے برعکس گرم ہے اور عورتوں، مردوں کے لئے الگ الگ کمرہ نما حوض بنا دیئے گئے ہیں، ہم لوگ وہاں پہنچے تو غسل کرنے والوں کا ایک ہجوم نظر آیا، چشمہ تو اب نظر نہیں آتا، کیونکہ اس میں پانی نکالنے کے لئے موٹر لگا دیا گیا ہے جس سے پانی دونوں حوضوں میں بھرتا رہتا ہے، چشمہ کے آس پاس بہت زیادہ سبزہ اور درخت نظر آئے اس سے اندازہ ہوا کہ وہاں کھیتی بھی ہوتی ہے۔

''عین النجم'' دیکھنے کے بعد ہم لوگ باغوں اور پارکوں کی سیر کرتے ہوئے واپس جائے قیام پہنچے اور پھر وہاں سے اپنی منزل ''ریاض'' کی راہ لی، ہفوف کا سفر بہت خوشگوار اور پر لطف رہا، جس کا اثر ابھی تک دل ودماغ پر باقی ہے، سفر کی روئداد اپنے دوسرے ساتھیوں کو سنائی تو ان کو بھی ''ہفوف'' کی سیر کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

جمعہ کی نماز سنگینوں کے سائے میں

یکم محرم بروز منگل ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۰/ نومبر ۱۹۷۹ء کی صبح ایک نیا ہنگامہ لے کر طلوع ہوئی۔ یہ سعودی عرب کی تاریخ کا تاریک ترین دن تھا، اس دن دینی حمیت کے حامل کچھ افراد نے حرم پر اپنا قبضہ جمالیا اور حکومت کے سامنے اپنے بعض مطالبات رکھے، مطالبات اگرچہ مناسب تھے لیکن اس کے منوانے کا طریقہ یقیناً غیر مناسب تھا، مزید یہ کہ ''ظہور مہدی'' کا ڈرامہ رچا کر اس کی ساری افادیت پر پانی پھیر دیا گیا، ممکن ہے بعض لوگ ''مہدی کے ظہور'' کو سعودی حکومت کا تراشہ ہوا افسانہ تصور کرتے ہوں جس کا شروع میں مجھے بھی شبہ تھا مگر ایسا نہیں ہے، مہدی کا ڈرامہ ان لوگوں نے یقیناً رچایا، جس کا مقصد دنیا بھر کے عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا تھا، مہدی کے ظہور کے شاہد تو بہت لوگ ہیں لیکن ہمارے ندوی ساتھیوں میں سلیم الرحمٰن خاں بھوپالی ندوی بھی ایک گواہ ہیں۔ شر پسند لوگ صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد ہوائی فائر کرتے ہوئے حرم میں داخل ہوئے اور حرم کے تمام مرکزی دروازوں پر قابض ہو گئے مائک پر اعلان کیا گیا کہ مہدی کا ظہور ہو گیا ہے، حاجی حضرات ان سے بیعت کر لیں، اور بعض لوگوں نے مہدی سے بیعت شروع بھی کر دی، بھوپال کے حاجی حضرات جو سلیم الرحمٰن خاں کے والد کے ساتھ تھے وہ بھی اسی وقت مہدی سے بیعت کرنے کے موڈ میں تھے مگر ان کے والد نے کہا کہ ابھی نہیں، پہلے یہ اطمینان تو ہو جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحیح اور درست ہے، پہلے باہر چلو، چل کر ناشتہ وغیرہ کر لیں، اس وقت تک صورت حال مزید واضح ہو جائے گی پھر بیعت کر لیں گے۔

یہ لوگ جب دروازہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سارے دروازے بند ہیں اور ان پر مسلح افراد متعین ہیں، اسی وقت ان لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ مہدی کا ظہور محض ایک فراڈ ہے۔ اس وقت حرم کے اندر کچھ تعمیری کام ہو رہا تھا، اس لئے ٹرک کے آنے جانے والا تہ خانے کا ایک راستہ کھلا ہوا تھا یہیں سے یہ لوگ ''جان بچی لاکھوں پائے'' کے مصداق باہر نکلے اور پھر دوبارہ حرم میں واپس نہیں گئے۔

۲۳/ نومبر کو ریاض میں ہم لوگ جب ہاسٹل سے نکل کر جمعہ کی نماز کیلئے مسجد کے قریب پہونچے تو دیکھا کہ مسجد چاروں طرف سے مسلح پولیس کے حصار میں ہے، اور جب اندر پہونچے تو وہاں بھی مسلح پولیس کا پہرہ موجود تھا حتی کہ ایک مسلح نوجوان امام صاحب کے سر پر بھی موجود تھا، زندگی کی یہ پہلی نماز تھی جو میں نے سنگینوں کے سائے میں ادا کی۔

حرم پر قبضہ ہونے کے پانچ روز کے بعد بڑی سوچ بچار کے بعد ۶/ محرم ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۵/

نومبر ۱۹۷۹ء کو حکومت نے فوج کو حرم کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیدی تو قبضہ کرنے والے تہ خانوں میں روپوش ہو گئے، آخر کمانڈو دستہ نے ۱۵/ محرم مطابق ۴/ دسمبر کو حرم کو قابضین سے آزاد کرایا بعض قابضین مقابلہ میں وہیں ہلاک ہوئے، ہلاک ہونے والوں میں ان کا فکری قائد محمد عبداللہ العتیبی بھی تھا جس نے مہدی کا دعوی کیا تھا باقی ۶۳/ افراد مع اپنے اہل وعیال کے گرفتار ہوئے اور ۱۷/ محرم مطابق ۶/ دسمبر کو شاہ خالد نے حرم کی صفائی ستھرائی کے بعد دوبارہ اس کا افتتاح کیا۔

ایک ہفتہ تک کو سعودی فوج سوائے ان کی بندوقوں کے نشانہ بننے کے اور کچھ نہ کر سکی ایک ہفتہ بعد کمانڈوز آئے تو وہ ٹینک لے کر مسعیٰ کی طرف سے اندر داخل ہوئے قبضہ کرنیوالے تہ خانوں میں چلے گئے ان کمانڈوز کو بھی قابضین کو تہ خانوں سے نکالنے میں ایک ہفتہ لگ گیا کعبہ کی تاریخ میں شاید پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک ہفتہ تک کعبہ کا طواف نہیں ہو سکا البتہ کعبہ کے اوپر صورت حال کا جائزہ لینے کیلئے ہیلی کاپٹر برابر چکر لگاتا رہا۔

کوئی فوجی اگر ان کی زد پر آ جاتا تو اس کو گولی مار دیتے، عام حاجی سے کوئی تعرض نہ کرتے، ان لوگوں نے تہ خانوں کے اندر غذا کے طور پر کھجور اور خشک دودھ کا بڑا اسٹاک اکھٹا کر رکھا تھا جو چھ ماہ کے لئے کافی تھا، اور زمزم کا کنواں تو حرم کے اندر ہی تھا، اس طرح انھیں بھوکا اور پیاسا رہنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا، حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ مع اہل وعیال حرم کے اندر مقیم تھے۔

ہفتہ عشرہ کے بعد حرم کے ہنگامہ میں پکڑے جانیوالے ۶۳/ مردوں کو مملکت کے مختلف شہروں میں پھانسی دیدی گئی، عورتوں اور بچوں کو اصلاح گھروں میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس حادثہ کے بعد حرم میں زمزم کے پانی کا موجودہ انتظام کیا گیا ورنہ پہلے لوگوں کو بڑی دشواری ہوتی تھی بعض بدو صراحیوں میں زمزم لئے گھومتے رہتے تھے اور کٹوروں میں پانی پلایا کرتے تھے اور جو کچھ پیسے ان کو دیدیئے جاتے وہ لے لیتے لیکن کچھ نہ کچھ دینا ضروری تھا۔

ربیع الاول کی تعطیل میں جب میں عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ گیا تو دیکھا کہ مسعی کی دیواروں کا پلستر جا بجا گولیوں سے ادھڑا ہوا ہے اور اس کی مرمت جاری ہے۔ حرم پر قبضہ کرنے کا مقصد کیا تھا اس کا تو علم نہیں ہو سکا، البتہ سننے میں آیا کہ ان کا پروگرام ایک ہی وقت میں مسجد نبوی، مسجد حرام اور ریاض میں شاہی محلوں پر قبضہ کرنا تھا تا کہ پورے ملک میں مکمل قبضے کے بعد وہاں مکمل اسلامی نظام نافذ کر دیا جائے مثلاً بینکوں میں سود کا نظام ختم کرنا معذور غریب، ضرورت مند بیمار افراد کی مدد کے لئے بیت المال قائم کرنا، ملک میں بڑھتا ہوا امریکی اثر ونفوذ ختم کرنا، حرمین کے اندر زمزم کی فروخت بند کر کے مفت تقسیم کرنا وغیرہ۔

طالب علمی سے ملازمت تک

جب میں ریاض پہنچا تھا تو میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں سعودی عرب میں ملازمت کرونگا، بلکہ یہی عزم تھا کہ تعلیم مکمل کرتے ہی فوراً ندوہ واپس جاؤں گا اور وہیں درس وتدریس میں مشغول ہوجاؤں گا، میں جس وقت ندوہ سے ریاض آیا تھا اس وقت بھی میں ندوہ میں استاذ تھا، اس کے علاوہ والد صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میں دفتری لائن میں آکر ضائع ہوگیا، میری تمام علمی صلاحیتیں ضائع ہوگئیں، اس لئے میں تم کو تدریسی لائن کے علاوہ کسی دوسری لائن میں نہیں جانے دونگا، اسی لئے ۱۹۷۸ء میں جب مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم کی طرف سے مجھے ''تعمیر حیات'' کے عملہ میں شامل کرنے کی پیشکش ہوئی تھی تو والد صاحب نے انکار کر دیا تھا۔

ایک روز جب میں والد صاحب کے پاس دفتر پہنچا تو انھوں نے فرمایا کہ مولانا اسحاق جلیس صاحب تم کو تعمیر حیات کے لئے مجھ سے مانگنے آئے تھے، لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری طرح غیر تعلیمی لائن میں آکر تمہاری صلاحیتیں بھی ضائع ہوجائیں، مولانا کہہ رہے تھے کہ میرے اکثر سفر میں رہنے کیوجہ سے پرچہ لیٹ ہوجاتا ہے اس لئے آپ عبدالرشید کو مجھے دیدیں تو وہ میری غیر موجودگی میں تعمیر حیات کی دیکھ بھال کرلیں گے اور رسالہ تیار کرلیں گے۔ ان دنوں ''تعمیر حیات'' میں مختلف کتابوں پر میرے تبصرے آرہے تھے اور مختلف موضوعات پر مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے، اور انھیں یہ بھی علم تھا کہ میں فضیلت کرنے کے بعد اب خالی ہوں کہیں ملازمت وغیرہ نہیں کررہا ہوں، غالباً اسی وجہ سے وہ میری طرف متوجہ ہوئے تھے، اس واقعہ کے بعد ہی جب معہد میں ایک استاذ کی جگہ خالی ہوئی تو والد صاحب نے اس کے لئے میری درخواست دلوادی اور میں معہد میں پڑھانے لگا، لیکن تین سال کے بعد وہی ہوا جو مشیت الٰہی میں میرا مقدر تھا ''من در چہ خیالیم وفلک در چہ خیال'' کے مصداق ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی غیر تعلیمی لائن اختیار کرنا پڑی اور جس طرح والد صاحب نہ چاہتے ہوئے بھی ندوہ میں دفتری ملازمت کرتے رہے اسی طرح میں بھی سعودی عرب کی وزارۃ الدفاع کے شعبۂ کمپیوٹر میں ۲۰ سال تک دفتری ملازمت کرتا رہا، اور اب لکھنؤ میں ندوہ کے جوار میں ''ندوی کمپیوٹر سروسیز'' اور ''ندوی آفسٹ پریس'' چلا رہا ہوں، جہاں عربی، اردو، انگریزی

کمپوزنگ، ڈیزائننگ، اسکیننگ، پرنٹنگ وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔ اور ''ندوہ کمپیوٹر سنٹر'' کا منیجر بھی ہوں۔

ہوا یوں کہ ۱۹۸۰ء کے اوائل میں جب جامعہ میں میرا تیسرا سال تھا جامعہ کی مجلس انتظامیہ نے ایم۔اے کے طلبہ کے لئے یہ نیا قانون پاس کیا کہ طلبا کو دو سال سے زائد وظیفہ نہ دیا جائے، طالب علم کا مقالہ مکمل ہو یا نہ ہو، جبکہ پہلے مقالہ مکمل ہونے تک وظیفہ دینے کا قانون تھا۔ میرے چونکہ تین سال پورے ہونے والے تھے اس لئے مجھے یقین تھا کہ میرے اسکالرشب کا یہ آخری سال ہے، اس لئے مجھے بڑی فکر تھی کہ تعلیم کا سلسلہ آگے کیسے جاری رہ سکے گا۔ اس کا تذکرہ میں اپنی ماموں زاد بہن ڈاکٹر کشور یعقوب مرحومہ سے بھی بعض ملاقاتوں میں کر چکا تھا، ایک روز اچانک ان کا پیغام ملا کہ کل صبح میرے پاس آجاؤ، میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ کیوں بلا رہی ہیں، صبح جب ان کے گھر گیا تو انھوں نے کہا کہ تم کو ابھی میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے، وہاں میں نے تمہارے لئے ملازمت کی بات چیت کرلی ہے، تم بھی چل کر کمپنی والوں سے مل لو، چنانچہ ہم لوگ ''سائسورکس انٹرنیشنل کمپنی امریکہ'' کے ریاض آفس پہنچے اور جنرل منیجر جناب صلاح الدین پرویز قریشی صاحب کے پاس گئے، وہ بڑے اخلاق اور تپاک سے ملے، ڈاکٹر کشور نے ان سے میرا تعارف کرایا، چائے کا دور چلتا رہا، دوران گفتگو انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم چاہو تو کل سے ''وزارة الدفاع والطيران العامة والمفتشتية العامة'' کے آفس میں کام شروع کردو (اس کمپنی کا وزارت کا تمام پرانا اور نیا ریکارڈ کمپیوٹرائز کرنے اور اس کو مائکروفلم کے ذریعہ محفوظ کرنے کا معاہدہ تھا) حالانکہ میں ابھی ملازمت کرنے کیلئے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھا، یہی سوچ رکھا تھا کہ چھ سات ماہ کے بعد ہی کوئی کام شروع کروں گا۔ لیکن چونکہ وہ بات کر چکی تھیں اس لئے ۲ر فروری ۱۹۸۰ء مطابق ۱۵ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ کو میں نے پارٹ ٹائمر کی حیثیت سے وزارۃ الدفاع کے ''ادارہ مرکز المعلومات'' میں ڈیوٹی جوائن کرلی، چھ سو امریکن ڈالر تنخواہ متعین ہوئی، اس طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی شروع ہوگئی، غالباً آخر اگست ۱۹۸۰ء میں جب رمضان کی تعطیل میں لکھنؤ گیا تو میں نے کمپنی کا ویزا لگوالیا، اور ستمبر ۱۹۸۰ء میں باقاعدہ سائسورکس کا ملازم ہوکر سعودی عرب واپس آگیا، مقالہ کی تیاری کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ۱۹۸۱ء سے میرا اسکالرشب بھی بند ہوگیا۔

ملازمت کے تقریباً چھ ماہ کے بعد میرے سپروائزر نے مجھے ناپسندیدہ یا غیر مرغوب سمجھ کر کمپیوٹر سیکشن میں منتقل کر دیا جبکہ میں کمپیوٹر کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا، بہر حال وہاں موجودہ پروگرام کی ضروری

کمانڈیں سیکھ کر میں نے کام شروع کر دیا، تقریباً ۸سال مختلف پروگراموں پراور I.B.M کے مختلف Terminals پر کام کرتا رہا، مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کمپیوٹر کی دنیامیں P.C. کی شکل میں ایک بڑاانقلاب آ چکا ہے اور مزید انقلاب آتے جارہے ہیں، لیکن میری لاعلمی کے باوجود مشیت الٰہی نے مجھے اس دروازہ تک پہنچادیا جہاں سے میری ترقی کی راہیں کھلتی چلی گئیں۔

کمپنی کے آٹھ سالہ دور ملازمت میں بڑے نشیب وفراز آئے، کئی بار بعض کرم فرماؤں نے مجھے کمپنی سے نکلوانے کی لاحاصل کوشش بھی کی، ان لوگوں کو اگر پہلے سے یہ علم ہوتا کہ میں ڈاکٹر کشور کا عزیز ہوں تو وہ لوگ کبھی میرے نکلوانے میں دلچسپی نہ لیتے، کیونکہ انھیں پتہ تھا کہ ڈاکٹر کشور کے کمپنی کے مالک عبدالسلام قریشی اور صلاح الدین پرویز سے بہت قریبی تعلقات ہیں، مجھ سے بعد میں کئی لوگوں نے خود شکایتی لہجے میں کہا کہ آپ نے کبھی یہ تذکرہ نہیں کیا کہ آپ ڈاکٹر کشور کے رشتہ دار ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ آپ نے کبھی پوچھا؟ میں کیا نقارہ لے کر سب جگہ اعلان کرتا پھرتا کہ میں ڈاکٹر کشور کا رشتہ دار ہوں؟ لوگوں کو وہاں یہ بات بعید اس لئے لگتی تھی کہ وہ پاکستانی تھیں اور میں ہندوستانی تھا، ان لوگوں کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ ہندوستانی اور پاکستانی ایک دوسرے کے عزیز بھی ہوسکتے ہیں۔

۱۹۸۴ء میں میری فیملی ریاض میں میرے ساتھ نہیں تھی کہ میں یرقان میں مبتلا ہوگیا تو چھٹی لے کر علاج کیلئے لکھنؤ آ گیا، اسی درمیان وزارت کی طرف سے ملازمین میں تخفیف کرنے کا نوٹس آ گیا میرے کچھ ہمدردوں نے موقع غنیمت جانا اور سپروائزر اور منیجر سے اصرار کر کے تین بار میرا نام اس فہرست میں شامل کروادیا لیکن ہر بار انھیں شرمندگی اٹھانی پڑی، جب بھی یہ فہرست ہیڈ آفس پہنچتی تو صلاح الدین پرویز صاحب (جنرل منیجر) یا خالد رشید عثمانی صاحب (پرسنل منیجر) میرا نام اس فہرست سے نکلوادیتے، آخری بار انھوں نے لکھ کر بھیجا کہ جو نام ہیڈ آفس سے کنفرم کئے گئے ہیں، انہیں لوگوں کی سروس ختم کی جائے گی، نام تبدیل نہیں کئے جائیں گے۔ میں جب تھوڑا صحتیاب ہوکر ریاض پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ بغض للٰہی میں میرے پیچھے لگ گئے ہیں اس لئے میں نے دوسری ملازمت کی تلاش شروع کردی، اور اللہ کے فضل سے ایک ہفتہ کے بعد ہی مجھے ''جامعۃ الریاض'' کے ''مستشفی الملک خالد'' میں ملازمت مل گئی، جب میرا ویزا اور ٹکٹ دہلی چلا گیا تو میں نے ڈاکٹر کشور سے کہا کہ مجھے کمپنی سے N.O.C. دلادیں تاکہ دوسرا ویزا لگوانے میں کوئی پریشانی نہ ہو، اتفاق سے ان ہی دنوں

عبدالسلام قریشی امریکہ سے آئے ہوئے تھے انھوں نے ان سے کہا کہ عبدالرشید نے دوسری ملازمت تلاش کر لی ہے اور اب کمپنی چھوڑ کر دوسرا ویزا لگوانے دہلی جارہے ہیں ان کو N.O.C. کی ضرورت ہے، عبدالسلام صاحب نے اصرار کے ساتھ کمپنی چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ عبدالسلام صاحب نے ڈاکٹر کشور مرحومہ سے مجھ سے وجہ معلوم کرنے کیلئے کہا، میں نے جواب دیا کہ کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں اس لئے میں کمپنی چھوڑ رہا ہوں، آپ ابھی مجھے رکھ کر چلے جائیں گے اور کل پھر وہ لوگ کوئی بہانہ بنا کر مجھے نکلوادیں گے، یہ سن کر انھوں نے کہا کہ ''میں فائل پر لکھ دوں گا کہ جب تک کمپنی ہے اس وقت تک عبدالرشید کمپنی میں رہے گا، اس کو کمپنی سے کوئی نہیں نکالے گا'' اس یقین دہانی کے بعد جامعہ والوں سے میں نے معذرت کر لی اور کمپنی ہی میں رہا، اس طرح کے کئی نشیب وفراز کمپنی کے زمانے میں آئے لیکن الحمدللہ کمپنی کے ذمہ داروں نے ہر بار میرا خیال رکھا اور میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونے دی۔

سائسورکس کمپنی میں گذارے ہوئے ایام اب یاد ماضی بن چکے ہیں لیکن ان دنوں کی یاد جب بھی آتی ہے تو اپنے محسنوں کیلئے دعاء خیر زبان پر آجاتی ہے، کمپنی کے مالک جناب عبدالسلام صاحب قریشی، جنرل منیجر جناب صلاح الدین پرویز قریشی صاحب اور پرسنل منیجر خالد رشید عثمانی صاحب کا خاص طور پر میں بہت مشکور ہوں کہ ان حضرات نے میرا بہت خیال رکھا اور مجھے کمپنی میں متعدد زائد سہولتیں مہیا کیں، اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ ان تینوں حضرات کو خصوصاً اور جن لوگوں نے میرے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا ان کو خصوصاً اپنے حفظ وامان میں رکھے اور دنیا اور آخرت میں اجر عظیم سے نوازے۔ (آمین)

سائسورکس کمپنی کے دوران ملازمت ہی غالباً اوائل ۱۹۸۷ء میں پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں ایک خط میں نے صدر ضیاء الحق مرحوم کو لکھا تھا جو اس خیال سے پوسٹ نہیں کیا کہ پتہ نہیں یہ خط ان تک پہنچے گا بھی یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ میرے جیسے کتنے ہی لوگ ہونگے جنہوں نے ضیاء الحق کو ادھر متوجہ کیا ہوگا، بہتر ہے کہ یہ خط پڑھنے سے پہلے اس خط کا پس منظر آپ سمجھ لیں تاکہ خط کا مضمون سمجھنے میں آسانی ہو۔

پاکستان میں ۱۹۸۵ء کے الکشن ہوچکے تھے اور ایک جمہوری حکومت برسر اقتدار آچکی تھی،

جونیجو مرحوم کو صدر نے اس توقع کے ساتھ وزیر اعظم بنایا تھا کہ وہ ان کے نفاذ اسلام کے مشن کو مزید آگے بڑھائیں گے لیکن وزیر اعظم انکی توقعات کے برعکس اسلام کے مخالف نکلے، پھر جب ایک ممبر پارلیمنٹ نے ''شریعت بل'' پیش کرنا چاہا تو انہوں نے اسکی اجازت نہیں دی، اس طرح شریعت بل پارلیمنٹ کے دروازے ہی سے واپس کر دیا گیا۔ جب اسلام پسند طبقہ نے زیادہ احتجاج کیا تو انہوں نے اسلامی نظام کے نفاذ یا عدم نفاذ کیلئے ملک میں ریفرنڈم کرایا جو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ایک بدترین مذاق تھا یہ بات دیگر حساس لوگوں کی طرح مجھے بھی بہت بری لگی، چونکہ اس وقت صدر ضیاء الحق مرحوم فوج کے چیف آف آرمی اسٹاف بھی تھے اس لئے میں اپنے طور پر یہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو بحیثیت صدر، یا چیف آف آرمی اسٹاف بذریعے آرڈیننس ملک میں اسلام نافذ کر سکتے ہیں، ان ہی جذبات واحساسات کے تحت یہ خط لکھا گیا تھا لیکن پوسٹ نہیں کیا جا سکا، پھر ۲۱ مئی ۱۹۸۸ء کے روز نامہ جنگ کراچی میں صدر ضیاء الحق کا یہ بیان شائع ہوا کہ ''نفاذ اسلام کے لئے آرڈیننس جاری کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے'' یہ بیان پڑھ کر میرے جذبات اور مشتعل ہو گئے اور میں نے لکھا ہوا خط انکو پوسٹ کرنیکا عزم مصمم کر لیا لیکن پھر اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے پیش نظر اس کو پوسٹ نہیں کر سکا، پھر ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو صدر ضیاء الحق مرحوم نے جراتمندی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ کچھ کر دیا جس کی میں نے اپنے خط میں تمنا ظاہر کی تھی، یعنی انہوں نے وزیر اعظم جونیجو کو معزول کر کے پارلیمنٹ تحلیل کر دی، اور بہت جلد ملک میں آرڈیننس کے ذریعہ اسلام نافذ کرنے کا اعلان کر دیا، لیکن پھر یکایک اور غیر متوقع طور پر وہ بھی ہو گیا جس کا میں نے اپنے خط میں اندیشہ ظاہر کیا تھا یعنی امریکہ کے اشاروں پر اور اپنوں کی ملی بھگت سے ان کو ان کے عزیز ترین رفقاء کے ساتھ ان کے ہوائی جہاز کو کریش کرا کے ان کو شہید کر دیا گیا اور وہ اسلام کی راہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان کا نذرانہ لئے ہوئے بارگاہ خداوندی میں پہنچ کر سرخرو ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو غریق رحمت کرے اور سب کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ (آمین)

سابق صدر پاکستان ضیاء الحق کے نام ایک خط جو پوسٹ نہ ہوسکا

محترمی جناب صدر پاکستان ضیاء الحق صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! بغیر کسی سابق تعارف کے محض ایک مسلمان بھائی ہونے کے رشتہ سے آپ کو یہ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں ؎

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات

آپ کے بقول ۷/ جولائی ۱۹۷۷ء کو فوجی انقلاب لانیکا مقصد ملک کی سلامتی اور اسلامی شریعت کا نفاذ تھا لیکن لوگوں کے بقول ''آپ کے اندر آہستہ آہستہ اقتدار کی ہوس بڑھتی گئی یہاں تک کہ آپ نے ریفرینڈم کرا کرا پنے آپ کو صدر بنالیا''

یہ بات بھی میری طرح اسلام پسند لوگوں نے اس لئے گوارا کر لی کہ موجودہ حالات میں اسلام کے نفاذ کے لئے اقتدار اعلیٰ کا ہونا بھی ضروری ہے، لیکن اب دو سال ہونے کو ہیں مگر اب تک ملک میں اسلام کا نفاذ نہ ہو سکا، نفاذ تو دور کی بات ہے ''شریعت بل'' کو پارلیمنٹ کے اندر داخل ہونے کی اجازت بھی نہ مل سکی۔ ایسا کیوں ہوا؟

پھر اسلام کا مذاق اس طرح اڑایا گیا کہ اسلام کے نفاذ کے لئے ملک میں ریفرینڈم کرایا گیا، اور مسلمانوں ہی سے معلوم کیا گیا کہ ان کو ''اسلامی نظام'' پسند ہے یا نہیں؟ جس ''اسلام'' کے نام پر ملک حاصل کیا گیا آج اسی اسلامی ملک میں پوچھ جا رہا ہے کہ ''آپ کو اسلام کا نفاذ پسند ہے یا نہیں''؟ یہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مذاق نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

اگر ''اسلامی نفاذ'' نافذ کرنے میں وزیر اعظم یا ملک کے دوسرے بااثر افراد یا امریکہ آڑے آ رہا ہے تو خدا کے لئے آپ ان سے ڈر کر اسلام کے نفاذ کو پس پشت نہ ڈالیں بلکہ آپ اسلام کو اپنے اثر ورسوخ اور طاقت کے زور پر نافذ کر دیں، زیادہ سے زیادہ ''ایک جان'' ہی کا تو زیاں ہے، لیکن آپ شہید ہونگے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سرخرو ہونگے ؎

بر تر از سود وزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جان، اور کبھی تسلیم جان ہے زندگی

اور اگر آپ جان کی خاطر ملک میں سیکولر نظام باقی رکھتے ہیں تو یاد رکھئے خدا کی لاٹھی بے آواز ہے، اگر مشیت الٰہی بھٹو جیسے فرعون کے لئے آپ جیسا موسیٰ متعین کر سکتی ہے تو آپ جیسے وعدہ خلاف، کرسی کے حریص کے لئے بھی کوئی موسیٰ پیدا کر سکتی ہے۔ ان حالات میں اگر آپ مارے گئے تو دنیا میں ذلیل وخوار ہونگے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی معتوب ٹھہریں گے اس لئے خدا کیلئے افراد اور امریکہ کا خوف اور اقتدار کا نشہ دل سے نکال کر صرف خدا کیلئے، خدا کے نام پر حاصل کئے ہوئے ملک میں ''خدائی

نظام'' قائم کردیں کہ اسی میں دنیا وآخرت کی کامیابی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد عبدالرشید ندوی

مجھے ضیاء الحق سے اسلام کے رشتہ سے جو محبت اور جذباتی لگاؤ تھا اسی محبت اور اپنائیت نے مجھ سے یہ خط لکھوایا تھا، اور میں نے جس اندیشہ کا ذکر کیا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوگیا، اس لئے اس خط کو آپ ''حدیث نفس'' کہہ لیں یا ''ایک مؤمن کی فراست'' کہہ لیں۔

مارچ ۱۹۸۸ء میں سائسورکس کا کنٹریکٹ وزراۃ الدفاع سے ختم ہوگیا تو وزارت نے ہم میں سے کچھ افراد کو اپنی کفالت میں لے لیا، باقی افراد کی چھٹی کردی گئی، کام وہی رہا البتہ کفالت تبدیل ہوگئی اور تنخواہ کچھ کم ہوگئی۔

۱۹۸۸ء کے آخر میں مجھے اور ڈاکٹر عطاء الرحمٰن ندوی کو یہ ہدایت کی گئی کہ ARMY کے ہیڈ کوارٹر جائیں اور وہاں جو کام کمپیوٹر پر کرنے کیلئے دیا جائے وہ انجام دیں، یہاں تقریباً تین ہزار افراد کا نتیجہ کمپیوٹر میں فیڈ کرنا تھا، جنہوں نے بری، بحری اور ہوائی فوج میں ملازمت کیلئے امتحان دیا تھا، یہ کام ہنگامی طور پر تقریباً دو ماہ جاری رہا، کام کا کوئی وقت متعین نہیں تھا بس دن رات لگ کر کام کرنا تھا اور نتیجہ مطبوعہ شکل میں ذمہ داروں کو دینا تھا، شروع میں تو کھانے کے لئے گھر آنے کا موقع مل جاتا تھا مگر آخری مرحلہ میں دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی وہیں فوجیوں کے Mess مطبخ میں کردیا گیا تاکہ جو وقت آنے جانے میں صرف ہوتا ہے اس کو کام میں لگایا جاسکے۔

اس سے قبل تک تو میرا سابقہ بڑے کمپیوٹر (Main Frame) سے تھا جس کا صرف ٹرمنل سامنے ہوتا ہے، اسی کے ذریعے ساری معلومات کمپیوٹر میں داخل کی جاتی ہے، اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ کمپیوٹر کیسے چلتا ہے، کیسے چھاپتا ہے، کیسے بند کیا جاتا ہے، یہاں میرے سامنے جو کمپیوٹر تھا وہ شخصی کمپیوٹر Personel Computer تھا اس کے بارے میں اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہ تھا کیونکہ اس کو مارکیٹ میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، ایک پروگرامر روزانہ آکر اس کو چلا دیتا تھا پھر ہم لوگ امتحان دینے والوں کا نتیجہ اس میں فیڈ کرتے تھے، اگر درمیان میں کچھ گڑبڑ ہوجاتی تو پروگرامر کو بلانا پڑتا تھا، کچھ روز تک تو وہ آتا جاتا رہا، پھر اس نے کمپیوٹر چلانیکا طریقہ سمجھا دیا، پہلے ڈاس Dos کی فلاپی سے

کمپیوٹر چلایا جاتا تھا پھر اس میں عربی پروگرام ''نافذۃ'' کی فلاپی لگا کر مطلوبہ کام کیا جاتا تھا، اس پر کام کرتے ہوئے ایک روز میں سوچنے لگا کہ اس میں عربی کی فلاپی لگا کر عربی چھاپی جاتی ہے اسی طرح اگر اردو کا کوئی پروگرام ہو تو کمپیوٹر سے اردو بھی لکھی اور چھاپی جاسکتی ہے، دو ایک لوگوں سے اس سلسلہ میں معلومات بھی حاصل کرنا چاہیں لیکن کوئی کچھ بتا نہیں سکا۔

اب جب کمپیوٹر کی بات آہی گئی ہے تو آیئے کمپیوٹر کے بارے میں بھی کچھ آپ کو بتاتے چلیں:

کمپیوٹر کی ایجاد ۱۹۵۰ء میں امریکہ میں ہوئی، اور سب سے پہلے اس کا استعمال امریکن فوج نے کیا، شروع میں اسکا حجم بہت بڑا تھا اور اس کو رکھنے کیلئے بڑے بڑے کمروں کی ضرورت ہوتی تھی پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا حجم چھوٹا ہوتا گیا لیکن کارکردگی بڑھتی گئی، فی الوقت تین حجم یا سائز کے کمپیوٹر پائے جاتے ہیں انکی نوعیت کے اعتبار سے ان کی کارکردگی بھی کم یا زیادہ ہوتی ہے، ان کا مختصر تعارف حاضر ہے:

کمپیوٹر کا تعارف

۱۔ سب سے بڑا کمپیوٹر: Main Frame Computer

یہ ۱۹۵۰ء کی پیداوار ہے، یہ کافی بڑا ہوتا ہے، اسے حکومتی ادارے اور بڑی بڑی کمپنیاں استعمال کرتی ہیں، ان کے رکھنے کے لئے خصوصی جگہ بنائی جاتی ہے اور ان کو ہر وقت ایک خاص ٹھنڈے درجہ حرارت میں رکھنا پڑتا ہے، یہ دوسرے شہروں اور ملکوں کے کمپیوٹر سے فون کی لائن اور Modem کے ذریعہ یا انٹرنیٹ کے ذریعہ منسلک ہوتا ہے۔ مثلاً جب آپ ائر انڈیا سے اپنا رزرویشن لکھنؤ سے دہلی، دہلی سے ریاض، ریاض سے لندن، لندن سے نیویارک کراتے ہیں تو آپ کے رزرویشن کی تمام تفصیلات دنیا بھر کے تمام ائر انڈیا کے آفسوں کے کمپیوٹروں میں آجاتی ہے اور آپ کسی بھی ملک میں ہوں وہاں سے اپنا رزرویشن چیک کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کی ان تمام ائر لائنوں کے کمپیوٹروں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جو ائر انڈیا کے کمپیوٹر سے منسلک ہیں، کمپیوٹر کے اس طرح کے استعمال کو نیٹ ورک Net Work کہتے ہیں، بڑے کمپیوٹر میں عام طور پر بیک وقت دو زبانوں میں کام کیا جاسکتا ہے اسی لئے اس میں استعمال ہونے والے پروگرام کو دو زبان والا پروگرام یعنی Bilingual Programe کہتے ہیں، عرب ممالک میں عام طور پر یہ پروگرام انگریزی اور عربی زبان کا ہوتا ہے اس لئے اس میں انگریزی وعربی زبان دونوں میں بیک وقت کام کیا جاتا ہے۔

۲۔درمیانہ کمپیوٹر Mini Computer

یہ کمپیوٹر درمیانہ سائز کا ہوتا ہے، یہ ۱۹۶۵ء کی ایجاد ہے، یہ عام طور پر یونیورسٹیوں، تحقیقاتی اداروں اور کمپنیوں میں استعمال ہوتا ہے، ۱۹۷۰ء میں جب کمپیوٹر کی متعدد نئی زبانیں ایجاد ہوگئیں تو اس کا ستعمال اور زیادہ بڑھ گیا۔

۳۔چھوٹا کمپیوٹر:-Micro Computer

یہ کمپیوٹر دونوں کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہوتا ہے، اس کو ذاتی (یا شخصی) کمپیوٹر اور انگریزی میں Personel Computer کہتے ہیں، اور مختصراً .P.C کہتے ہیں، یہ ۱۹۸۰ء کی پیداوار ہے، اس کے لئے کسی خاص جگہ یا کسی خاص درجہ حرارت کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، اس کمپیوٹر کی قیمت بڑے اور درمیانے کمپیوٹر کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے اس کا استعمال ذاتی ضروریات کے لئے بھی ہوتا ہے، اور چھوٹی موٹی کمپنیوں، بینکوں اداروں، اسکولوں وغیرہ میں بھی اس کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، بڑے کمپیوٹر کی طرح اس کمپیوٹر کو بھی دوسرے کمپیوٹروں سے انٹرنیٹ کے ذریعہ منسلک کر دیا جاتا ہے، چھوٹے کمپیوٹر کے اس طرح کے استعمال کو LAN یعنی Local Area Net Work کہتے ہیں۔

Main Frame اور PC

بڑے اور چھوٹے کمپیوٹر میں کیا فرق ہے ؟

ان دونوں کمپیوٹروں میں صرف چھوٹے اور بڑے کے فرق کے علاوہ ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ بڑے کمپیوٹر میں جو معلومات داخل کی جاتی ہیں وہ کوڈ Code میں یعنی رمز میں داخل کی جاتی ہیں اور لکھی جانیوالی عبارتیں چند سطروں سے زائد نہیں ہوتیں، اس عمل کو کمپیوٹر کی اصطلاح میں Data Entry کہتے ہیں، اور چھوٹے کمپیوٹر میں جو بھی کام ہوتا ہے وہ سب مکمل طور پر عبارتوں میں لکھنا پڑتا ہے، اس میں کوڈ ورڈ کا استعمال نہیں ہوتا، کمپیوٹر کی اصطلاح میں اس عمل کو Word Processing کہتے ہیں اور اگر اکاؤنٹنگ کا کام ہے تو اعداد لکھنے پڑتے ہیں، ورڈ پروسیسنگ کا کام عموماً بڑے کمپیوٹر سے نہیں لیا جاتا ہے کیونکہ یہ کام اس کے منصب سے بہت کمتر ہے۔

اب ان دونوں میں فرق کو ذرا تفصیل سے سمجھ لیں:

(ا) بڑا کمپیوٹر عام طور پر کسی بڑی کمپنی یا کسی حکومتی ادارہ میں لگا ہوتا ہے، اس کا CPU علیحدہ کسی کمرہ

میں ہوتا ہے اور اس کا تعلق فون اور موڈم یا انٹرنیٹ اور پھر سٹیلائٹ کے ذریعہ مختلف شہروں اور ملکوں سے ہوتا ہے، جہاں CPU رہتا ہے وہی اس کمپنی یا ادارہ کا ہیڈ آفس ہوتا ہے۔سب سے پہلے وہ پروگرام کمپیوٹر کے CPU میں لوڈ کیا جاتا ہے جس پر کام کرنا مقصود ہوتا ہے، اس پروگرام میں تمام وہ معلومات ہوتی ہیں جن کی کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے، یہ معلومات جدولوں Tables کی شکل میں کمپیوٹر میں پہلے ہی فیڈ کر دی جاتی ہے، جدولوں کے کوڈ نمبر ہوتے ہیں، یہ جدولیں سیکڑوں اور ہزاروں بھی ہوسکتی ہیں ان معلومات کو کمپیوٹر کی بنیادی معلومات Basic Information کہا جاتا ہے۔کمپیوٹر کو استعمال کرنے والا کوئی شخص بھی ان معلومات میں کوئی اضافہ یا تبدیلی یا حذف نہیں کرسکتا، وہ صرف معلومات داخل Data Entry کرنے کا کام کرتا ہے، ایسے شخص کو کمپیوٹر کی اصطلاح میں User کہتے ہیں اور جس اسکرین پر وہ کام کر رہا ہے اس کو ٹرمینل Terminal کہتے ہیں۔ Terminal User کوڈ نمبروں کے سہارے ساری معلومات کمپیوٹر میں داخل کر دیتا ہے، اسی کو Data Entry کہتے ہیں، اس میں چند لائنوں سے زیادہ کوئی عبارت نہیں لکھی جاتی، پھر جو معلومات آپ چھاپنا چاہیں چھاپنے کی کمانڈ Prnt Command دے کر مطلوبہ معلومات چھاپ لیں، جدولوں سے معلومات کس طرح حاصل کی جاتی ہے اس کو آپ ایک مثال سے سمجھیں:

مثلاً ملکوں میں ہندوستان کا کوڈ 1 پاکستان کا کوڈ 2 بنگلہ دیش کا کوڈ 3 افغانستان کا کوڈ 4 سعودی عرب کا کوڈ 5 فیڈ کر دیا گیا، اسی طرح ملک کے ذمہ داروں میں بادشاہ کا کوڈ 1 صدر کا کوڈ 2 وزیر اعظم کا کوڈ 3 وزیر داخلہ کا کوڈ 4 وزیر دفاع کا کوڈ 5 فیڈ کر دیا گیا، اب اگر آپ کو کمپیوٹر میں یہ معلومات داخل کرنا ہے کہ منموہن سنگھ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں تو آپ پہلے خانہ میں صرف اٹل منموہن سنگھ لکھیں گے، دوسرے خانہ میں ملک کا کوڈ نمبر (ا) اور تیسرے خانہ میں ذمہ دار کا کوڈ نمبر (۳) لکھیں گے اور جب آپ یہ معلومات چھاپیں گے تو اس طرح چھپے گی:

منموہن سنگھ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں۔

ان جدولوں میں بڑی بڑی عبارتیں بھی لکھ کر داخل کی جاسکتی ہیں، مثلاً چھٹی کی درخواست کی منظوری کا کوڈ (ا) نئی تقرری کا کوڈ (۲) ملازمت سے ٹرمینیشن کا کوڈ (۳) وغیرہ، اب آپ کو جو لیٹر چھاپنا ہو اس کا کوڈ نمبر اور جس آفیسر کے نام سے چھاپنا ہو اس کے عہدہ کا کوڈ نمبر اور جس کے نام سے

چھاپنا ہے اس کا نام لکھ کر چھاپ لیں۔

۲۔ چھوٹے کمپیوٹر پر بہت سے کام کئے جاسکتے ہیں مثلاً اکاؤنٹنگ کا کام، گرافک کا کام، ڈیزائننگ کا کام اور ورڈ پروسیسنگ کا کام اس پر اچھی طرح سے ہوسکتا ہے یعنی اس پر کوئی مضمون کمپوز کرنا، یا مقالہ لکھنا، یا کتاب لکھنا بہت آسان ہے، البتہ کوئی چیز کو ڈورڈ میں نہیں لکھی جاسکتی، سوائے اس کے کہ کوئی چھوٹا موٹا پروگرام اس غرض کے لئے خصوصی طور پر بنالیا جائے۔

اس کے علاوہ جس زبان میں آپ کو کام کرنا ہے اسی زبان کا پروگرام بھی کمپیوٹر میں Load لوڈ کرنا ہوگا، جس طرح جو زبان آپ کو سننی ہوتی ہے اسی زبان کا کیسٹ آپ ٹیپ ریکارڈر میں لگاتے ہیں۔ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کا کمپیوٹر کس زبان کا ہے، اردو کا ہے یا ہندی کا یا انگریزی کا؟ یہ سوال اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ سوال کرنا غلط ہے کہ آپ کا ٹیپ ریکارڈ اردو زبان کا ہے یا ہندی کا یا انگریزی کا۔ کیونکہ ٹیپ ریکاڈر کی کوئی زبان نہیں ہوتی بلکہ اس میں لگے ہوئے کیسیٹ میں جس زبان میں معلومات بھری گئی ہے وہی زبان آپ کو سنائی دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح آپ جس قسم کے کام کے لئے اور جس زبان کا پروگرام کمپیوٹر میں لگائیں گے اسی طرح کا اور اسی زبان میں کمپیوٹر کام کرے گا۔

دو ماہ بعد جب میں ہیڈکوارٹر کا کام مکمل کر کے اپنے **ادارہ مرکز المعلومات** میں واپس آیا تو آخر دسمبر ۱۹۸۸ء میں ادارہ کے ذمہ داروں نے مجھے اور کئی ساتھیوں (محمد ایوب قاسمی، حمید اشرف قاسمی علیگ، نجم الدین ندوی) کو کام سے علیٰحدگی کا لیٹر دے دیا، البتہ یہ کہہ دیا کہ اگر کسی جگہ ملازمت مل جائے تو ہم ٹرانسفر لیٹر دیدیں گے، چنانچہ مجھے نیوی ہیڈکوارٹر (R.S.N.F. HQ) کے ادارہ **متابعة المشاريع** Projects Tracking Department میں جگہ مل گئی اور میں ۲ جنوری ۱۹۸۹ء کو وہاں منتقل ہوگیا۔

نیوی میں پہلے تو میں WANG کمپیوٹر پر کام کرتا رہا یہ درمیانے سائز کا کمپیوٹر تھا اور صرف انگریزی کا م کرنے کے لئے تھا، اس کو چلانے کے لئے ایک فلپائنی متعین تھا، جب وہ چھٹی پر جاتا مجھے کمپیوٹر کے آپریشن (کھولنے، بند کرنے، چلانے، پرانا ڈاٹا لوڈ کرنے) کا طریقہ لکھوا کر جاتا، اسی تحریر کی مدد سے میں مہینے دو مہینے کمپیوٹر چلاتا رہتا اور الحمدللہ اس کام میں مجھے کبھی کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ چند سالوں بعد جب نیوی کا Main Frame پر چلنے والا Bilingual پروگرام تیار ہوگیا تو میں دونوں

کمپیوٹروں پر کام کرنے لگا WANG کمپیوٹر کا پروگرام صرف انگریزی زبان میں تھا اس لئے اس پر سارا کام انگریزی ہی میں ہوتا تھا IBM کے Main Frame کا پروگرام Bilingual (عربی انگریزی دونوں زبانوں میں) تھا اس لئے اس میں دونوں زبانوں میں معلومات فیڈ کرنا پڑتی تھی۔ دو تین سال کے بعد جب IBM کمپیوٹر پوری طرح کام کرنے لگا اور WANG کمپیوٹر کی ساری معلومات IBM کمپیوٹر میں منتقل کردی گئی تو WANG کمپیوٹر پر کام بند کردیا گیا۔ IBM کمپیوٹر کے لئے جب ادارہ نے دوسرا پروگرام بنوانا شروع کیا تو پروگرامر کے معاون کے طور پر مجھے متعین کیا۔ اس پروگرام کی بنیادی معلومات Basic Information سب سے زیادہ میں نے ہی عربی انگریزی دونوں زبانوں میں فیڈ کیں۔ اور جب پروگرام کی گائیڈ بک MANUAL تقریباً ۲۰۰ صفحے کی تیار ہوئی تو میں نے ہی پوری گائیڈ بک پہلے P.C. پر اور بعد میں IBM کمپیوٹر پر لکھی۔ کئی سال بعد اس ادارہ کا نام بدل کر" **ادارہ المساندة الفنية** " TECHNICAL SUPPORT DEPARTMENT کردیا گیا۔

نیوی میں سروس کے گیارہ سال بڑے اطمینان وسکون سے گذرے اس دوران مطالعہ، درس و تدریس تصنیف وتالیف اور بعض سماجی کام کرنے کا موقع ملا مثلاً ۱۹۹۱ء میں عصری تعلیم یافتہ حضرات میں درس قرآن اور درس بخاری شریف کا سلسلہ شروع کیا جس میں مختلف پیشوں سے وابستہ حضرات شریک ہوتے تھے، ان حضرات کا تعلق زیادہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تنظیم سے تھا، یہ سلسلہ ۱۹۹۶ء تک جاری رہا بابری مسجد کے انہدام (۶ دسمبر ۱۹۹۲ء) کے بعد عرب وغیر عرب حضرات کو ہندوستانی مسلمان اوران کے مسائل کی طرف مختلف مضامین لکھ کر اور متعدد مضامین کا عربی ترجمے کر کے اور بعض دوسروں سے کرا کران کو لیف لیٹ کی شکل میں تقسیم کرایا، محمد محمود حسانین مصری سے متعدد مضامین کے ترجمے بابری مسجد اور کشمیر کے موضوع پر اور متعدد مضامین دیگر موضوع پر لکھوا کر مختلف اخبار ورسائل میں شائع کروائے۔ ''آل انڈیا ملی کونسل، ریاض'' کے قیام کے وقت (جنوری ۱۹۹۳ء) ہی سے اس کا اساسی ممبر رہا، اس سلسلہ میں ملی کونسل کی ممبر سازی کے لئے کافی دوڑ بھاگ کی اور آخر وقت تک اس کا خازن اور اساسی ممبر رہا۔ اسی دوران متعدد رسالے تحریر کئے، اب ماہنامہ ''بانگ حرا لکھنؤ کا نومبر ۲۰۰۴ء سے ایڈیٹر ہوں، اور مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

❁❁❁

بعض ملکی وغیر ملکی تاریخی واقعات وحادثات

عَاصِفَۃُ الصَّحرَاء/ اُمُّ المَعَارک

Mother of Battles \ Storm of Desert

۲/ اگست ۱۹۹۰ء کو جمعرات کے دن میں صبح صبح ''شاہین'' بقالہ (جنرل اسٹور) گیا تو راستہ میں ایک عجیب سی خاموشی اور پراسراریت کا احساس ہوا، خلاف معمول سڑکوں پر چہل پہل بھی نہیں نظر آئی، بقالہ کے اندر گیا تو وہاں بھی کئی لوگ موجود تھے لیکن وہاں بھی اسی خاموشی اور پراسراریت کا سماں تھا، ہر شخص خاموش تھا، مگر مجسم سوال بنا ہوا تھا؟ جس کو خبر تھی وہ بھی اور جس کو خبر نہیں تھی وہ بھی۔ میں چونکہ ریڈیو سننے یا ٹی وی دیکھنے کا عادی نہیں ہوں اس لئے مجھے بھی کچھ خبر نہ تھی کہ رات کتنا بڑا اور عجیب حادثہ پیش آ چکا ہے، ذرا دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا جیسے کچھ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں، میں نے فوراً ادھر کان لگا دیئے، جو کچھ سنا اس پر یقین نہ آیا، لیکن اس خبر نے ذرا دیر کے لئے مجھے خود بھی نقش حیرت بنا دیا، معلوم ہوا کہ عراق نے رات کے پچھلے پہر کویت پر حملہ کر کے پورے کویت پر قبضہ کر لیا ہے، اور ماحول پر پُر اسراریت اس وجہ سے چھائی ہوئی ہے کہ سعودی عرب نے اس سلسلہ میں ابھی تک کوئی اعلان نہیں کیا ہے، اس لئے ہر شخص یہ خبر منہ سے نکالتے ہوئے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ حکومت کی نظروں میں نہ آجائے یا گرفتار نہ کر لیا جائے، غالباً سعودیہ اس حادثہ سے اس قدر نروس ہو گیا تھا کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ پبلک کو اس واقعہ کی خبر کس طرح اور کس انداز میں دی جائے، یا پھر امریکہ کے اس پریشر کی وجہ سے پریشان تھا جو سعودی عرب کی حفاظت کے نام پر سعودیہ میں اپنی فوجیں زبردستی اتارنے پر مصر تھا، اور ہائی کمان کو کوئی فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی، بہر حال سعودیہ نے دن گذرنے کے بعد غالباً اسی رات میں سانحہ کا اعلان کر دیا اور امریکی فوجوں کی سعودی عرب میں آمد کے لئے عوام کی ذہن سازی شروع کر دی، اور امریکی فوج قسطوں میں سعودی عرب پہنچے لگی۔

امریکہ نے سعودی عرب میں آتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ وہ صرف سعودیہ کی حفاظت کے لئے آیا ہے، عراق سے جنگ کرنا اس کا مقصد نہیں ہے، سعودی چیف آرمی اسٹاف نے یہ اعلان کیا کہ سعودیہ کی سرحدوں سے عراق پر کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا، لیکن لگتا ہے بعد میں امریکہ نے سعودیہ کو جنگ کرنے

پر مجبور کر دیا، کیونکہ بغیر جنگ کے امریکہ کو کوئی فائدہ نہ ہوتا اور نہ عالم اسلام اور مسلمانوں کا کوئی نقصان ہوتا، امریکہ کا مقصد عالم اسلام کی عسکری طاقت وقوت اور اقتصادی حالت دونوں ہی کو تباہ و برباد کرنا تھا اور اس مقصد کا حصول بغیر جنگ کے ممکن نہ تھا، اور پھر بقول صدیق سالک، جنگ کا ٹھیکہ امریکہ کو دیدیا گیا، جس میں جنگی اخرجات کے علاوہ امریکی اور اتحادی ملکوں کے فوجیوں کی تنخواہیں بھی شامل تھیں۔ اخراجات کا نصف سعودی عرب کو اور نصف کویت کو دینا تھا، فوجیوں کا سارا خرچ کھانا پینا رہائش دوا علاج اس کے علاوہ تھا اور یہ سب سعودیہ کے ذمہ تھا۔

امریکہ نے ''جنگ خلیج'' یا صحیح لفظوں میں ''خلیج کا جنگی ڈرامہ'' کے لئے ۱۹۷۱ء ہی سے پلاننگ شروع کر دی تھی، سننے میں یہ آیا کہ اس جنگ کی ریہرسل جنگ سے چند سال پہلے امریکہ کے گرم صحراؤں میں کر لی گئی تھی۔ جب ''عرب-اسرائیل جنگ'' کے دوران شاہ فیصل نے پٹرول کو بطور ہتھیار استعمال کیا تھا اور یہ بیان دیکر امریکہ کے ہوش اڑا دیئے تھے کہ: اگر امریکہ نے سعودی عرب کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرنے کوشش کی تو ہم تیل کے کنوؤں کو میزائل سے اڑا دیں گے، اونٹ کی سواری کریں گے اور کھجور کھائیں گے لیکن امریکہ کو تیل کے کنوؤں پر قبضہ نہیں کرنے دیں گے''۔

امریکہ نے شاہ فیصل کے اس بیان پر سنجیدگی سے غور کیا اور اور سب سے پہلے تو شاہ فیصل کو قتل کرایا، پھر سعودی عرب میں اپنی فوجوں کے قدم جمانے کی پلاننگ شروع کر دی، اور بالآخر گلف وار کے ذریعہ وہ اپنی پلاننگ میں کامیاب ہو گیا۔ شاہ کا ایران جو امریکہ کا سب سے بڑا حلیف تھا جب خمینی کے ایران میں تبدیل ہوا تو ایک زبردست مذہبی طاقت بن کر ابھرا جو امریکہ کا سب سے بڑا دشمن تھا، اس لئے امریکہ نے عراق کو ایران سے آمادہ جنگ کیا اور خلیجی ملکوں کو عراق کی مدد کے لئے تیار کیا، اور عراق کے لئے ان کو ہر قسم کا اسلحہ دینے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا، اور اپنی شاطرانہ حکمت عملی سے جنگ کو مسلسل طول دیتا رہا تا کہ عربوں کی ساری جمع پونجی اسلحہ کی خریداری میں ختم ہو جائے، آخر ایران نے آٹھ برس کی جنگ سے تنگ آ کر خود ہی جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔

ایران کے خلاف تمام عرب ممالک، خصوصاً کویت اور سعودی عرب کی مالی اور اسلحے کی امداد سے اور آٹھ سالہ جنگ کے تجربہ کے بعد جب عراق ایک بڑی طاقت بننے لگا تو امریکہ کو اپنے چہیتے اسرائیل کی فکر لاحق ہوئی تو امریکہ نے عراق کو بھی ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنایا، چنانچہ امریکہ نے عرب

ملکوں کے پرانے آپسی جھگڑوں کوابھارنا اور ہوا دینا شروع کردیا، خاص طور پر کویت کے ساتھ سرحدی معاملوں اور تیل کے کنوؤں کے سلسلے کے اختلافات کوخوب خوب بڑھاوا دیا اور مختلف طریقوں سے عراق کوکویت پرحملہ کرنے کی ترغیب دینا شروع کردی، اور جب عراق امریکہ کے جھانسے میں آگیا اور دونوں کوآمادہ بجنگ دیکھا تو ۱۵/ اگست کوصدام حسین کو یہ کہلا دیا کہ اگر عراق نے کویت پر حملہ کیا تو امریکہ غیر جانبدار رہے گا، چنانچہ عراق میں متعین امریکی سفیرہ مسز گلاسپی (M/s April Glaspi) نے ۱۵/ اگست کی رات کوصدام حسین سے گفتگو کے دوران یہ کہہ دیا کہ اگر عراق کویت پرحملہ کرتا ہے تو امریکہ کوکوئی اعتراض نہ ہوگا، یہ بیان دینے کے بعد اسی رات مسز گلاسپی نے بغداد چھوڑ دیا اور امریکہ روانہ ہوگئیں۔ دوسری طرف امریکہ نے کویت پرحملہ شروع ہوتے ہی کویت کا خیر خواہ بن کر سعودی عرب کواس حملہ کی اطلاع بھی دی اور مشورہ بھی دیا کہ کویت فوراً ہیلی کاپٹر بھیج کر امیر کویت اوران کے خاندان کی جان بچائی جائے ورنہ سب ختم کردیئے جائیں گے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ ختم کردیئے جاتے تو کویت کو آزاد کرانے کا دعوی کون کرتا، اور عراق کوکویت سے نکالنے کے لئے جنگ کا ٹھیکہ کون دیتا؟ میرا خیال ہے کہ جب عراق سے جنگ کرنے کا ٹھیکہ کویت اور سعودی عرب نے لے لیا تو امریکہ ہی نے سعودی عرب کی طرف سےلڑی جانیوالی جنگ کا نام "عاصفة الصحراء" (صحرائی طوفان Desert's Storm) رکھا، (یہ ایک فوجی اصول ہے کہ جب کوئی جنگی پلان بنتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا جاتا ہے) کیونکہ امریکہ نے اپنے فوجیوں کوسعودی عرب کے صحرائی میدانوں میں جنگ لڑنے کی جو ٹریننگ امریکی صحراؤں میں دی تھی اس کا نام بھی "عاصفة الصحراء" ہی تھا۔ اور شاید عراق نے امریکہ ہی کے مشورہ سے جنگ خلیج کا نام "ام المعارک" رکھا تھا جو بڑا معنی خیز ہے، کیونکہ اس نام کے اندر امریکہ کے لانگ ٹرم پلان کی جھلک نظر آتی ہے، یعنی خلیج کی یہ جنگ ایک ماں ہے جو آئندہ بہت سی جنگوں کوجنم دیتی رہے گی، یا یہ جنگ بہت سی جنگوں کے تسلسل کی ابتداء ہے جو کافی دنوں تک مسلسل کسی نہ کسی حیثیت سے جاری رہے گی، آپ اس وقت بھی دیکھ لیں کہ جنگ خلیج کوختم ہوئے ۱۴ سال ہوگئے مگر امریکہ اب بھی مختلف اسلامی ملکوں پر کسی نہ کسی بہانہ جنگ مسلط کئے ہوئے ہے۔

❁❁❁

اور جنگ چھڑ گئی

دسمبر ۱۹۹۰ء تک عراق کوسمجھانے کے لئے مختلف سیاسی اور غیر سیاسی طریقے استعمال کئے گئے (دنیا کے عوام کودکھانے کے لئے) لیکن نتیجہ صفر ہی نکلا، اور آخر امریکہ نے اقوام متحدہ سے عراق پر حملہ کرنے کی ایک قرارداد منظور کرالی، اور عراق کیلئے جنگ یا کویت سے واپسی دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی آخری تاریخ ۱۵/جنوری متعین کردی۔

۱۵ جنوری کویت سے واپسی کی آخری تاریخ تھی اور یہ منگل کا دن تھا، جب ۱۶/کا دن بھی بخیر خوبی گذر گیا تو دوسروں کی طرح میں نے بھی یہی سوچا کی جنگ وغیرہ کچھ نہیں ہوگی صرف عراق کو دھمکانے کے لئے یہ تاریخ متعین کی گئی تھی لیکن ۱۶/کی شام کوڈیوٹی کے بعد جب میں بحریہ کے ہیڈکوارٹر سے باہر نکلا تو دیکھا ہیڈ کوارٹر کے مرکزی دروازے کے سامنے اوپن جیپوں پر مشین گنیں نصب کی جارہی ہیں، جب بحریہ کے مرکزی گیٹ سے باہر نکلا تو سامنے ہی بالو کی بوریوں کا مورچہ اور نصب شدہ توپیں نظر آئیں، اور میری بس جب ڈیفنس کے علاقے کے بعد وزارۃ الداخلیہ کے سامنے سے گذری تو وہاں بھی یہی منظر دکھائی دیا۔ میرا دل وہیں سے کھٹک گیا کہ اب کچھ ہونے والا ہے، لیکن اس دن کچھ نہیں ہوا، لیکن دل میں خدشہ باقی تھا، ۱۷/کی رات کوسوتے وقت میں نے بی۔ بی۔ سی سنا تو وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تک عراق اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے، جنگ کا دور دور پتا نہیں، دوسری طرف ظہران کا ایک منظر بیان کیا کہ ایک امریکن فوجی اپنی بیوی اور بچے سے جدا ہورہا ہے دونوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں کیونکہ کچھ پتہ نہیں کہ وہ محاذ جنگ سے زندہ واپس لوٹے گا یا نہیں (امریکی فوج میں دس فیصد عورتیں بھی تھیں، اسی اعتبار سے امریکی فوجی عورتیں بھی سعودی عرب آئی تھیں، جو عام طور پر ڈرائیور یا سکریٹری وغیرہ کے فرائض انجام دیتی تھیں، اس کے علاوہ بعض فوجی اپنی بیوی بچوں سمیت سعودی عرب آئے تھے) بی۔ بی۔سی کی اس رپورٹ سے میرا ماتھا ٹھنکا کہ لگتا ہے آج جنگ شروع ہوجائے گی۔ کیونکہ یہ بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات تھی اور جنگ کے لئے مناسب تھی عراق نے بھی بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات ہی کویت پرحملہ کیا تھا، (جمعرات اور جمعہ کوسرکاری آفسوں میں چھٹی رہتی ہے) چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جو خدشہ میں دل میں لے کر سویا تھا اس نے آخری پہر کی رات میں حقیقت کا روپ دھار لیا، امریکہ

نے رات ۳ بج کر ۴۰ منٹ پر اپنے اتحادیوں کے ساتھ عراق پر حملہ کر دیا، رات چار بجے تقریباً فون کی گھنٹی بجنے لگی، رسیور اٹھایا تو دوسری طرف مرزا طیب صاحب کہہ رہے تھے کہ جنگ شروع ہوگئی ہے، ٹی وی آن کریں، یہ کہہ کر انھوں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا، میں نے ٹی وی کھولا تو دیکھا کہ لوگ کوئی جشن منا رہے ہیں، میں سمجھا کہ شاید کویت پر پہلے ہی حملہ میں فتح حاصل ہوگئی ہے، اور کویت پر اتحادی فوجوں کا قبضہ ہوگیا ہے یا عراق نے اپنا مواصلاتی نظام درہم برہم ہونے کی وجہ سے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، اور جنگ ختم ہوگئی ہے اس لئے یہ خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ یہ میری توقع کے عین مطابق تھا، کہ عراق زیادہ دیر اتحادیوں کے سامنے ٹک نہیں سکے گا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اندازہ ہو کہ ان لوگوں نے پیشگی جشن منانا شروع کر دیا ہے، کیونکہ چند گھنٹوں کے بعد فتح یقینی ہے لیکن یہ چند گھنٹے ۴۳ دن کی طوالت اختیار کر گئے، اتنی جلدی جنگ ختم کرنے سے امریکہ یا مغربی فوجوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا، آخر ان لوگوں کو اپنا پرانا اسلحہ فروخت کرنا تھا، کچھ نیا اسلحہ آزمانا تھا، اور سب سے اہم بات یہ کہ کویت اور سعودیہ کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوکر اپنے ملک کی اقتصادی حالت کو مضبوط بنانا تھا، اس لئے جنگ اتنا طول دیا گیا۔

یہ جنگ محض ایک ڈرامہ تھا جس کے بہت سے شواہد ہیں، اخبارات میں برابر یہ اعلان کیا جارہا تھا کہ حملہ کے وقت مزید نئی ہدایتیں ٹی وی پر دی جائیں گی اور اگر عراق نے کیمیائی حملہ کیا تو اس سے بچاؤ کے مزید طریقے بھی ٹی وی پر بتائے جائیں گے۔ کیا اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ ٹی وی اسٹیشن ہی کو عراق سب سے پہلے بمباری کا نشانہ بناتا؟ پھر عوام کو ضروری ہدایات ٹی وی پر کیسے دی جاتیں؟ اور کیمیائی حملہ کی صورت میں عوام کو موت کے منھ سے کیسے بچایا جاتا؟ یہ سب باتیں جنگ کے محض ایک ڈرامہ ہونے کی دلیل ہیں کیونکہ امریکیوں کو پتہ تھا کہ ہونا کچھ نہیں، ورنہ کیمیائی حملہ کی صورت میں سب سے پہلا حملہ تو فوجیوں کی چھاؤنیوں پر ہی کیا جاتا، اور سب سے پہلے امریکی فوجی ہی موت کا شکار ہوتے، اس کے علاوہ آخر سیکڑوں ٹن وہ بارود کہاں غائب ہوگئی جو عراق پر بموں کی شکل میں پھینکی گئی اور اس نے عراق کا ایک بال بھی بیکا نہ کیا؟ اور نہ کوئی خاص تباہی مچائی؟ کیا اس کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی؟

اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ یہ جنگ حقیقتاً جنگ تھی یا محض ایک ڈرامہ تھی جو عربوں کو نفسیاتی طور پر دہشت زدہ کرنے، ان کا جمع سرمایہ ہتھیانے اور پورے گلف پر اپنے پنجے گاڑنے کے لئے تھی۔

جنگ کے دوران جنگ کی رپورٹنگ کیلئے سعودی فوج کی طرف سے عربی زبان میں ایک اخبار

" **صوت المعركة** " کے نام سے نکلنا شروع ہوا، اور جب سعودی عرب کے پٹرول کا شہر " **الخفجی** " عراق کے قبضہ میں جا کر دوبارہ سعودی عرب کے قبضہ میں آ گیا اور سیکڑوں عراقی فوجی گرفتار کر لئے گئے یا انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو اس پرچہ کا نام بدل کر " **النصر** " رکھدیا گیا۔ دونوں رسالوں کے چند شمارے میں نے ندوہ کے کتب خانہ میں محفوظ کرا دیئے ہیں۔

بمبار جہازوں کے سائے میں دہلی کا سفر

جن لوگوں کو جنگ کے آثار نظر آئے اور جنگ سے گھبرائے وہ شروع ہی میں چھٹیاں لے لے کر اپنے اپنے ملک چلے گئے، جن کو چھٹی نہیں ملی وہ استعفیٰ دے کر چلے گئے، لیکن میں چونکہ ہندوستان میں تین جنگیں دیکھ چکا تھا اس لئے میرے لے جنگ سے گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی، جب جنگ سے کچھ عرصہ پہلے سارے ملکوں کی فلائیٹیں بند ہوگئیں اور سعودی عرب کے تمام اہم ہوائی اڈے فوجی ہوائی اڈوں میں تبدیل کردیئے گئے تو جنگ سے ڈرنے والوں نے بری راستوں سے اپنے اپنے ملک جانا شروع کردیا، مثلاً بہت سے پاکستانیوں نے اردن، شام، ایران، افغانستان ہوتے ہوئے پاکستان جانا شروع کردیا۔ جو لوگ سعودی عرب سے باہر نہ جاسکے وہ اپنی فیملی کو جدہ یا مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ جا کر چھوڑ آئے، جو لوگ یہ بھی نہ کر سکے وہ ریاض شہر سے دور دیہاتوں میں منتقل ہوگئے کیونکہ عراقی میزائل کا نشانہ بننے کا امکان ریاض شہر اور اس کے حکومتی ادارے تھے، لیکن میں جہاں تھا وہیں تن بہ تقدیر مقیم رہا حتی کہ میری بلڈنگ کی تینوں فیملیاں بھی دیہات منتقل ہوگئیں اور میرے آفس کے بعض ساتھی بھی قریبی دیہاتوں میں منتقل ہوگئے۔

دو سال سے میری چھٹی ڈیو تھی، ایک بار چھوٹے بچے کی بیماری کیوجہ سے لکھنؤ کا سفر منسوخ کرنا پڑا اور دوسری بار ہندوستان میں بابری مسجد کے سلسلہ میں ہنگامی حالات کی وجہ سے لکھنؤ جانا منسوخ ہوا، پھر چند ماہ بعد ہی سعودیہ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے اور جنگ شروع ہوتے ہی تمام ملکوں کی ساری فلائٹیں بند ہوگئیں اور خلیجی سمندر میں موجود امریکی بحری بیڑے کے چیف نے یہ اعلان کردیا کہ اگر کسی ملک کی کوئی فلائیٹ عربین گلف پر دیکھی گئی تو اسے Hit کردیا جائے گا، (ہندوستان، پاکستان، برما اور بنگلہ دیش وغیرہ میں بری، بحری، اور ہوائی تمام فوجیں بری فوج کے کمانڈر کے ماتحت ہوتی ہیں اور تمام امریکی فوجیں بحری فوج کے ماتحت ہوتی ہیں) لیکن جنگ شروع ہونے کے ایک ماہ بعد جب میں نے یہ اعلان سنا کہ صرف بمبئی اور دہلی کی فلائٹوں کو جانے کی اجازت دیدی گئی ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی، میں سمجھ رہا تھا کہ اگر اجازت مل سکتی ہے تو صرف پاکستان کی فلائٹوں کو مل سکتی ہے نہ کہ ہندوستانی فلائٹوں کو، کیونکہ پاکستان مسلمان ملک ہے اور سعودی عرب سے اس کے قریبی اور پرانے تعلقات ہیں۔ میں نے جب یہ اعلان سنا تو فیملی کو لکھنؤ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ جنگ میرے

اندازے سے زیادہ طویل ہوگئی تھی اور رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی بلکہ اس میں مزید شدت آتی جارہی تھی اور لکھنؤ میں میرے والدین اور رشتہ دار نیز بیگم کے والدین اور عزیز واقارب بہت پریشان تھے، کیونکہ ہندوستان میں یہ خبریں دی جارہی تھیں ریاض شہر اب ویران ہو چکا ہے، کھانے پینے کی قلت اور دشواری ہے، بجلی کا سارا نظام درہم برہم ہوچکا ہے اور لوگوں نے ریاض شہر سے بھاگنا شروع کردیا ہے، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

چنانچہ لکھنؤ کے سفر کی تیاری کرلی گئی، فضائی خطرات کے پیش نظر کرایہ میں تقریباً ایک ہزار ریال کا اضافہ کردیا گیا۔ آٹھ بجے لائن میں لگا تو تقریباً دو بجے بورڈنگ پاس ملا، اور ۱۴/فروری کو صبح ۶ بجے گھر سے ائرپورٹ کے لئے روانگی ہوئی، تقریباً ۹ بجے سعودیہ ائرلائن کے جہاز نے ٹیک آف کیا۔ ایک گھنٹے بعد اعلان ہوا کہ مسافر حضرات اپنی بیلٹ باندھ لیں جہاز جدہ ائرپورٹ پر اترنے والا ہے۔ یہ اعلان سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ جہاز مشرق کے بجائے مغرب کی طرف (جدہ) کیوں نحوِ پرواز ہے؟ شاید کچھ گڑ بڑ ہوگئی ہے یا فضائی خطرات بڑھ گئے ہیں، پتہ نہیں جدہ سے کب جہاز روانہ ہو؟ جہاز جدہ ائرپورٹ پر اترا، کچھ دیر ٹھہرا اور پھر دہلی کے لئے پرواز کر گیا تو دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ جہاز دہلی غالباً ۶ بجے شام کو پہنچا، ائرپورٹ پر رش بہت تھا اس لئے کسٹم وغیرہ سے نکلتے نکلتے رات کا ایک بج گیا۔ پھر دوسرے روز لکھنؤ کے لئے گومتی ٹرین سے روانگی ہوئی۔

بمبئی اور دہلی کی فلائٹوں کو اجازت ملنے کا راز ہندوستان ائرپورٹ سے باہر نکلنے کے فوراً بعد ہی مجھ پر عیاں ہوگیا، وہاج اشرف اور حبیب الرحمٰن صدیقی مجھے لینے ائرپورٹ آئے تھے، باہر نکلتے ہی میں نے سب سے پہلے ان لوگوں سے یہی سوال کیا کہ معلوم نہیں کہ جہاز کو ہندوستان آنے کی اجازت کیسے اور کیونکر مل گئی؟ وہاج اشرف نے بتایا کہ امریکی بمبار طیارے پٹرول لینے بمبئی آتے ہیں پھر یہاں سے اپنے ہدف پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں حالانکہ ہندوستانی حکومت امریکہ کے خلاف تھی اور سرکاری طور پر اس کی ساری ہمدردیاں عراق کے ساتھ تھیں اسی وجہ سے جہاز کو ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی۔ دوسرے روز صبح جب اخبار دیکھا تو اس میں بھی یہی خبر تھی کہ وزیراعظم چندر شیکھر نے ملک کی پالیسی کے خلاف ذاتی طور پر امریکی طیاروں کو بمبئی سے ایندھن فراہم کرنے کی اجازت کیوں دے رکھی ہے؟ وہ اس کا جواب دیں ہندوستانی عوام کو جب وزیراعظم چندر شیکھر کی اس

دوغلی پالیسی کا علم ہوتو کئی دنوں تک اخباروں میں اس کا ہنگامہ رہا، پھر چند روز کے بعد ہی جب ۲۵ فروری ۱۹۹۱ء کو ۴۳ روزہ جنگ کا خاتمہ ہوا تو چندر شیکھر کو وزارت کے عہدے سے چلتا کردیا گیا۔ پاکستانی فلائٹوں کو اجازت نہ ملنے کی وجہ سے پاکستانی بھی دہلی اور بمبئی ہوکر پاکستان جارہے تھے۔

پاکستانی فلائٹوں کو جانے کی اجازت اس لئے نہیں دی گئی کہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو اور آرمی چیف مرزا اسلم بیگ دونوں نے امریکہ کے خلاف بیان دیئے تھے اور پاکستانی فوج کو سعودی عرب بھیجنے سے انکار کیا تھا۔ اس کے بعد ہی بے نظیر کو وزیراعظم کے عہدے سے چلتا کردیا گیا تھا اور نواز شریف کو وزیراعظم بنا گیا تھا، انھوں نے آتے ہی پاکستانی فوج کو سعودی عرب جانے کی اجازت دیدی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد بحریہ نے بڑے پیمانے پر اپنے فوجیوں کو ترقیاں دیں، اور تمام فوجیوں کو بطور انعام نقد ریال بھی دیئے، البتہ میڈل سعودی غیر سعودی، فوجی غیر فوجی سب کو دیئے، مجھے بھی ''وسام الأمن'' جنگ کے زمانے میں آن ڈیوٹی رہنے کی وجہ سے دیا گیا، جو دو مختلف رنگ کے فیتوں اور دو دھات کے تمغوں پر مشتمل ہے، ایک سینہ پر لگانے کیلئے اور دوسرا کندھے پر لگانے کیلئے ہے۔

اس جنگ کے بعد امریکی دباؤ کی وجہ سے عرب ملکوں کے تعلقات اسرائیل سے کم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے گئے، یہودیوں کی وہ کمپنیاں جو پہلے عرب ملکوں میں بلیک لسٹیڈ تھیں اب وہ وہائٹ لسٹیڈ ہوگئی اور ان کمپنیوں کا مال کھلے عام سعودی عرب کے بازاروں میں آنے لگا، مثلاً کوکا کولا کمپنی کے تمام مشروبات، اور لنکن وفورڈ کاریں وغیرہ، اسی طرح پہلے تمام عرب ملکوں کے ریڈیو اسٹیشنوں اورٹی وی چینلس سے اسرائیل کے لئے **العدو الاسرائیلی** (اسرائیلی دشمن) کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے وہ بھی ترک کردیئے گئے اب صرف اسرائیل کا لفظ استعمال کیا جانے لگا۔

❁❁❁

بابری مسجد کی شہادت
اور سعودی عرب میں اس کا ردِعمل

۶ردسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد منہدم کردی گئی، "انا لله وانا اليه راجعون" مسجد کے انہدام کی خبر سنتے ہی یہاں کے لوگوں میں ایک آگ سی لگ گئی، جگہ جگہ، جلسے اور میٹنگیں شروع ہوگئیں، اور حکمراں پارٹی کانگریس کو سبق سکھانے کے منصوبے اور مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے ذرائع ووسائل پر غور وخوض ہونے لگا، بعض جوشیلے اور جذباتی افراد کا نظریہ یہ تھا کہ چونکہ ہندوستانی حکومت نے ہندوستانی دستور کے اس عہد کی پاسداری نہیں کی جس میں مسلمانوں کے حقوق تسلیم کئے گئے ہیں اس لئے اب ہم بھی ہندوستانی حکومت کے قوانین کے پابند نہیں رہے، ادھر سے وعدہ خلافی ہوئی ہے تو ادھر سے بھی عدم تعاون کا رویہ اپنانا چاہئے، اور حکومت کو ہر طرح کے ٹیکس دینا بند کردینا چاہئے۔

میں نے جب یہ سنا کہ بابری مسجد کو منہدم کرنے والے افراد مسجد کے اینٹ اور روڑے اٹھا اٹھا کر بطور نشانی اپنے ساتھ گھر لے گئے ہیں تو سن کر تکلیف تو بہت ہوئی لیکن پھر یکایک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ممکن ہے اس میں بھی اللہ تعالی کی کوئی مصلحت ہو اور اللہ تعالی ان ہی اینٹوں اور روڑوں کو ان کی تباہی وبربادی کا ذریعہ بنادے، اور بعد کے واقعات اور حادثات نے اس خیال کو سچ ثابت کردیا۔ کچھ افراد تو گھر پہنچنے سے پہلے ہی اندھے ہوگئے، اور جن علاقوں کے افراد مسجد کے اینٹ اور پتھر لے کر گئے تھے ان علاقوں میں یا تو طاعون کا عذاب لوگوں کو نگل گیا (جس میں ایک شخص بھی مسلمان نہ تھا) یا ہیبتناک زلزلہ نے ان لوگوں کو پیوند خاک کردیا، اور رہی سہی کسر طوفانی بارشوں نے پوری کردی۔

بابری مسجد گرانے کے بعد مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں کو بری طرح مارا پیٹا گیا، ان کی املاک کو تباہ وبرباد کیا گیا، معصوم افراد کو شہید کیا گیا، پاکدامن عورتوں کی عزتیں پامال کی گئیں، اور بابری مسجد کے انہدام کو ''قابل فخر کارنامہ'' کا نام دیا گیا۔ اللہ تعالی کا یہ ایک تکوینی نظام ہے کہ ظلم کسی کو پھلتا نہیں ہے، اس میں چھوٹے بڑے مسلم غیر مسلم، عورت مرد، بچے بوڑھے کی کوئی تخصیص نہیں ہے ۔

ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں

مئی ۱۹۸۷ء میں جب میرٹھ کا خوفناک فساد ہوا تھا اسوقت مولانا علی میاں ندویؒ نے اپنی مؤمنانہ فراست سے جو کچھ کہا تھا وہ بابری مسجد کے انہدام کے موقع پر حقیقت بن کر سامنے آگیا، اور ہندوستان کو اور خاص طور پر ان لوگوں کو جو بابری مسجد کی شہادت میں شریک تھے ان کو خدائی انتقام نے اپنی گرفت میں لے لیا، اس معاملہ میں حکومت کو اور بی جے پی کو بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے، مولانا نے فرمایا تھا :

> ''اگر اس ملک میں ظلم و بربریت، اخلاقی قدروں کی پامالی، انسان سوزی اور نسل کشی کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا، اور اس کو روکنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تو اس ملک کیلئے نئے خطرات اور مسائل ایسی جگہ سے پیدا ہوں گے اور اس طرح سے اچانک نمودار ہونگے کہ نہ کوئی نجومی اس وقت اس کی پیشین گوئی کرسکتا ہے، اور نہ کوئی بڑے سے بڑا دوربین، سیاسی مبصران کی خبر دے سکتا ہے .....ایک جگہ کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد ملک میں پیش آنے والے حوادث اور ان کا شکار ہونے والوں کی تعداد پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ حساب نہ صرف برابر ہو گیا، بلکہ کچھ بڑھ گیا''۔ (کاروان زندگی صفحہ ۲۰۲ حصہ سوم)

ایک دوسری تقریر میں مولانا نے فرمایا تھا :

> ''میں ایک مذہبی انسان اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہمارے گناہ اور ظلم کے نتیجہ میں آسمانی آفتیں آتی ہیں، خدا یہ دکھاتا ہے کہ مارنے کا سامان ہمارے پاس تم سے زیادہ ہے، جب بھی ظلم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو میں ڈر جاتا ہوں کہ کوئی قدرتی تازیانہ انسانوں کی طرف نہ بڑھے''۔ (کاروان زندگی صفحہ ۲۱۱ حصہ سوم)

مولانا نے جو کچھ فرمایا تھا بعد کے حادثات اور واقعات نے اس کی تصدیق کردی، چنانچہ بابری مسجد گرنے کے بعد ہندوستان کو سب سے پہلا جو جھٹکا لگا، وہ اقتصادی جھٹکا تھا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ء مطابق ۱۷ ر رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ بمبئی میں جمعہ کی نماز کے وقت وقفہ وقفہ سے ۴۳ ر منٹ کے دوران مختلف مقامات پر بڑے طاقتور بم پھٹے جس میں ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے، اور کروڑوں روپیہ کی املاک تباہ و برباد ہو گئیں، بم کیوں پھٹے؟ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ یہ پتہ لگانا اور ان کو سزا دینا پولیس اور سی آئی ڈی کا کام ہے، بم پھٹنے کے نتیجہ میں مہینوں کے لئے عروس البلاد بمبئی کا سارا کاروبار ٹھپ ہو گیا، غیر ملکی

سیاحوں کا آنا جانا رک گیا، غیر ملکی سرمایہ جو ہندوستان میں لگنا تھا وہ وقت پر نہ لگ سکا، اور صرف بمبئی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کا ہر آدمی مہینوں اپنے پڑوسی ہی سے نہیں بلکہ اپنے سایہ سے بھی ڈرتا اور خوف کھاتا رہا۔

کلکتہ میں بھی بم کے دھماکے ہوئے، یہ بندوں کی انتقامی کارروائیوں کا نتیجہ تھے، یا پھر تخریب کاروں اور سیاست دانوں کی ملی بھگت کا شاخسانہ تھے، یہ پتہ لگانا حکومت کا کام ہے، اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ قدرت نے بھی انتقام لیا، اور ۲۹، ستمبر کو رات ۳ بج کر ۵۵ منٹ پر مہاراشٹر میں ایک خوفناک زلزلہ آیا، خاص طور پر لاتور میں جہاں کے شرپسند لوگ بابری مسجد کو شہید کرنے میں پیش پیش تھے، اور اس رات بھی ایک مصنوعی بابری مسجد ڈھا کر آرام سے سو رہے تھے، اس زلزلہ نے بموں سے کہیں زیادہ تباہی مچاہی، بموں سے صرف چند ہزار آدمی اپنی جان کی بازی ہارے تھے لیکن زلزلے سے تقریباً ایک لاکھ آدمی زندہ درگور ہو گئے، سیکڑوں عالیشان عمارتیں، ہزاروں کچے پکے مکانات زمین بوس ہو گئے اور بعض علاقوں میں تو یہ بھی دیکھا گیا کہ زمین پھٹی اور گاؤں کے گاؤں دھرتی کی آغوش میں سما گئے، اور کروڑوں روپیہ کا سونا چاندی، ہیرے جواہرات زمین الگ نگل گئی۔

قدرت کا انتقام ابھی ٹھنڈا نہیں پڑا تھا، جب ادھر سے کچھ سکون ہوا تو سورت میں طاعون نے سر ابھارا، طاعون اس گاؤں سے شروع ہوا جہاں کے لوگوں نے مسلمان لڑکیوں، اور عورتوں کو بے آبرو کیا تھا، ان کو سڑکوں پر برہنہ دوڑایا تھا، اور سارے منظر کی ویڈیو فلمیں بنائی تھیں، سننے میں آیا کہ سورت میں سب سے پہلے وہی شخص مرا جس نے اس انسانیت سوز حرکت کی پلاننگ اور قیادت کی تھی، اور پھر یہ انسانی بم جب سورت سے بھاگنا شروع ہوئے تو پورے ہندوستان میں ایک تہلکہ مچ گیا، آس پاس کے ملکوں نے ہندوستان سے ہر قسم کے رابطے منقطع کر لئے، بری، بحری فضائی تمام راستے ہندوستان کے لئے بند ہو گئے، تجارت ٹھپ ہو گئی، اور ہندوستان جو مسلمانوں کو اچھوت کہتا ہے، بھری پری دنیا میں خود اچھوت بن کر رہ گیا، اور اربوں روپئے یومیہ کا نقصان الگ ہوا، کروڑوں کا تجارتی مال ائر پورٹوں اور سی پورٹوں پر پڑا سڑتا اور برباد ہوتا رہا اور ملک کی اقتصادیات متاثر ہوتی رہی، غرض کہ بابری مسجد گرانے کے جرم میں ابھی ہندوستان کو، ہندوستانی حکومت کو اور ہندوستانیوں کو اور کیا کیا بھگتنا ہے اس کا علم تو صرف اسی کو ہے جس کا وہ گھر تھا۔ بابری مسجد کے متعلق ہفت وار ''نشیمن'' بنگلور میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، وہ مجھے بہت پسند آیا، آپ بھی اسے ملاحظہ کریں:

بابری مسجد؟

بابری مسجد کے تعلق سے آپ نے بہت کچھ پڑھا اور سنا ہے، اور اب بھی اس کا سلسلہ برابر جاری ہے لیکن ایک اہم بات جس پر کوئی بھی غور نہیں کررہا ہے وہ یہ ہے کہ بابری مسجد نے ہندوستان کو پکڑ لیا ہے، اور اس کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود ڈھیلی نہیں پڑ رہی، جس طرح قدرت کا فولادی پنجہ اور قانون کا آہنی ہاتھ مجرم کو پکڑ لیتا ہے اور پیس کر رکھ دیتا ہے اسی طرح اب بابری مسجد کا پنجہ بھی ہندوستان پر پڑ گیا ہے۔ اس کے اثرات ہر طرف پھیل رہے ہیں ہر جگہ، ہر زبان پر اور ہر اخبار میں اس کا چرچا ہے، جہاں دیکھو اسی کی باتیں ہیں، ہر ایک کے ذہن وقلب میں اسی کے بارے میں سوال ہے، کوئی نہیں جانتا کہ اس سے کب پیچھا چھوٹے گا، کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ مسئلہ کیونکر اور کب حل ہوگا؟

بابری مسجد سب کے لئے ایک معمہ ہے، ہر شخص اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کررہا ہے، مگر یہ گہرا اور پیچیدہ ہوتا جارہا ہے، ہر ایک اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کررہا ہے مگر یہ الجھتی جارہی ہے، بابری مسجد جب اجودھیا میں کھڑی ہوئی تھی تو فرقہ پرستوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی، اب نہیں ہے تو حکومت کے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے، ۱۹۸۶ء میں جس دن اس کا تالا کھولا گیا اس دن سے آج تک وہ ہر اخبار کے صفحہ اول پر بیٹھی ہوئی ہے، ہر روز اس کے متعلق ایک بیان آتا ہے تو دوسرے دن جوابی بیان آتا ہے، بابری مسجد نے ہر زمانے میں ہر ایک کے اندازے، خیال اور نظریئے کو غلط ثابت کر دکھایا۔ فرقہ پرست سمجھتے تھے کہ بابری مسجد ایک پرانا ڈھانچہ ہے، ایک بوسیدہ عمارت ہے، اور ایک گر پڑنے والی چیز ہے، اگر اسے گرادیا گیا تو چند دن واویلا ہوگا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اسی خیال کے تحت ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اسے شہید کردیا گیا، حکومت بھی چونکہ فرقہ پرستوں سے اندر ہی اندر ملی ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ بابری مسجد کسی طرح گرجائے تو ایک کانٹا نکل جائے، لہذا وہ فرقہ پرستوں کے اشتعال انگیز، غیر قانونی اور غیر جمہوری کارسیوا پر خاموش رہ گئی، مگر سب نے دیکھا کہ یہ بوسیدہ عمارت جاتے جاتے اپنے ساتھ ہندوستان کی جمہوریت، سیکولرزم، نیک نامی، عزت ووقار، سب کچھ لے گئی، بابری مسجد کیا گری اس کے ساتھ ہی ہندوستان کا امیج بھی گر پڑا۔ بابری مسجد نے پورے ملک میں امن وامان کا مسئلہ پیدا

کردیا ہے عوام کا سکون وچین چھین لیا ہے، اقتصادی ڈھانچہ بیٹھ گیا ہے۔ تجارت، صنعت، پیداوار، اور روزگار پر اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔ فرقہ پرست حیران ہیں کہ انہوں نے کیا سمجھا تھا اور کیا ہوگیا۔ حکومت پریشان ہے کہ حالات کو معمول پر لانے اور واقعات وحادثات پر کنٹرول کرنے کے لئے کیا کرے۔ پولیس اور فوج فکر مند ہے کہ فسادات، لوٹ مار، قتل وغارت گری کی روک تھام کیونکر کرے، ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروپ بابری مسجد کے انہدام سے پیدا ہونے والے اثرات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کررہا ہے، مگر کامیاب نہیں ہوتا۔

بابری مسجد نے کانگریس میں پھوٹ ڈال دی، وزیر اعظم کا منھ کالا کردیا، حکومت کو ذلیل ورسوا کرکے رکھ دیا، سرکار کے اعتماد کو لوگوں کے دلوں سے نکال کر پھینک دیا۔ عالمی برادری میں ہندوستان کا سر نیچا کردیا۔ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا، کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بابری مسجد پورے ہندوستان کو اسطرح اپنی لپیٹ میں لے لے گی، اور اس کی کایا پلٹ دے گی۔ بابری مسجد اس وقت ملبے کا ایک ڈھیر ہے مگر اس کا ہر ذرہ لوگوں کے دل ودماغ میں آگ بن کر سما گیا ہے، اور سب کو بے چین کئے ہوئے ہے، اخبارات، رسائل، کتب، سب بابری مسجد کے احوال سے بھرے ہوئے ہیں، مورخین، محققین، آثار قدیمہ کے ماہرین، فن کار، ادیب، شاعر، صحافی، وکیل، سیاستدان، عالم، مولوی، اسکالر، پنڈت، سنت، سادھو، مہنت، بھکشو، پادری، امام، سوشل ورکرس غرض سب کے سب بابری مسجد پر بول رہے ہیں، اور اپنی تجویز پیش کررہے ہیں، یعنی بابری مسجد نے سب کو کام پر لگا رکھا ہے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بابری مسجد پورے ہندوستان کو یوں خون میں نہلائے گی اور آگ میں جلائے گی۔ شہر کے شہر اور گاؤں کے گاؤں یوں راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے۔ وہ لوگ جن کو اللہ نے عقل وآنکھ دی ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ تو ابتداء ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ اللہ کے گھر کی بے حرمتی کی سزا چھوٹی اور معمولی نہیں ہوتی، ایک طویل عرصے تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اور جب تک توبہ نہیں کی جاتی اس وقت تک تباہی وبربادی کا چکر ختم نہیں ہوتا۔

(ہفت روزہ نشیمن بنگلور فروری، ۱۹۹۳ء)

۞۞۞

ریاض میں ''آل انڈیا ملی کونسل'' کی تشکیل

بابری مسجد کے انہدام کے چندروز بعد ایک ہنگامی میٹنگ میں ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی اور اس کا امیر مجھے چنا گیا، اور تمام حاضرین نے باقاعدہ میرے ہاتھ پر بیعت کی اور فوری طور پر فساد زدہ مسلمانوں کے لئے کچھ رقم بھی جمع کی گئی، اتفاق سے اس میٹنگ کے چندروز کے بعد یکم جنوری ۱۹۹۳ء کو مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ، مولانا مجیب اللہ ندوی اور عبدالرحیم قریشی صاحب موسسین ''آل آنڈیا ملی کونسل'' دہلی کی ریاض آمد ہوئی، اور "الندوة العالمية للشباب الاسلامى" میں تینوں حضرات کی تقریریں بھی ہوئیں، اور ریاض میں آنڈیا ملی کونسل کی شاخ کھولنے کا فیصلہ ہوا۔ مولانا مجاہدالاسلام قاسمی صاحب نے سات افراد پر مشتمل ایک ایڈہاک کمیٹی بنادی جو ریاض میں ''آل انڈیا ملی کونسل'' کی تشکیل کرنے کی ذمہ دار تھی، ان سات حضرات میں راقم سطور، عبدالسلام قاسمی، عبدالباری قاسمی، نظام الدین، قاضی جیا وغیرہ تھے۔

ہم لوگوں نے جو تنظیم بنائی تھی وہ تنظیم بھی ''آل انڈیا ملی کونسل'' میں ضم کردی گئی، اور یہ تنظیم اپنے مقاصد واہداف کے حصول میں سرگرم ہوگئی۔

ریاض میں ''مجلس ابناء ندوہ'' کی تشکیل

۲۳ر نومبر ۱۹۹۴ء کو جب میں ۳ر بجے سہ پہر آفس سے گھر واپس پہنچا تو معلوم ہوا کہ سعید مرتضٰی ندوی کا فون آیا تھا، میں نے سعید کو فون کیا تو ان سے معلوم ہوا کہ رات میں مرکزی پولیس نے ندوہ پر چھاپا مارا تھا، گولیاں بھی چلائیں تھیں اور ے طلباء کو پکڑ کر لے بھی گئی ہے۔ یہ خبر سن کر اسقدر افسوس ہوا کہ بتا نہیں سکتا، پھر دوسرے ہی روز سعید سے چھاپہ سے متعلق بیانات اور خبروں کے فیکس لکھنو سے آئے ہوئے وصول ہوئے، میں نے ان بیانات کو فوری طور پر اردو سے عربی زبان میں کمپیوٹر سے کمپوز کر کے ان کا پرنٹ آؤٹ نکالا اور ندوی حضرات اور ندوہ سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی وعربی حضرات کو اس کی کاپیاں پہنچائیں، تیسرے یا چوتھے روز مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو اس سلسلہ میں ایک فیکس بھی روانہ کیا، اور آفس کے مصری ساتھی محمد محمود حسانین سے کہا کہ وہ عرب حضرات کی ایک میٹنگ کر کے ان کی طرف سے ایک احتجاجی مراسلہ صدر ہند کو بھیجنے کے لئے تیار کردے، چنانچہ اس نے ایک احتجاجی مراسلہ تیار کر کے اور مختلف ملک کے افراد سے اس پر دستخط کرا کے میرے حوالہ کیا جو میں نے صدر ہند کو فیکس کر دیا۔

اسی دوران ڈاکٹر سعید الرحمان فیضی ندوی کا فون آچکا تھا کہ ہم ندوی لوگوں کو کچھ کرنا چاہئے، یہ طے کرنے کیلئے ایک میٹنگ ندویوں کی بلالی جائے، چنانچہ تمام ندوی حضرات کو فون کے ذریعے اس میٹنگ کی اطلاع دیدی گئی، اور اسطرح ''مجلس ابناء ندوہ' ریاض'' کی تشکیل عمل میں آئی، جس کا مقصد ندوی برادری کا آپس میں ربط وتعلق، ندوہ سے بذریعہ خط وکتابت، جرائد ورسائل ربط وتعلق، ندوی فکر کا فروغ، علمی و دینی مجالس وسیمنار کا وقتاً فوقتاً انعقاد وغیرہ تھا۔ مجلس کی میٹنگ میں جو کچھ طے ہوا اس کی کاروائی مختصراً یہ ہے:

اجتماع ندوی برادران ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء

ابناء ندوہ کا ریاض میں پہلا جلسہ ۲۸ر نومبر ۱۹۹۴ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پر پولیس چھاپے پر احتجاج کے لئے ڈاکٹر مسعود ندوی صاحب کی صدارت میں خود ان ہی کے مکان پر منعقد ہوا، جلسہ کا آغاز سعید مرتضٰی ندوی کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا، جس میں بطور احتجاج مندرجہ ذیل قرارداد

پاس ہوئی، اور یہ احتجاجی قرارداد ذریعہ فیکس صدر جمہوریہ ہند، وزیر اعظم ہند، وزیر اعلی یوپی، صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ، اور پرنسپل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو بھیجی گئی۔ ساتھ ہی ''مجلس ابناء ندوہ'' تنظیم بنانے اور آئندہ جلسے جاری رکھنے کی بات طے ہوئی، جلسہ کا اختتام دعاء پر ہوا، پاس شدہ قرارداد کا متن یہ ہے :

عزت مآب جناب صدر جمہوریہ ہند

۲۰ / جمادی الآخرۃ ۱۴۱۵ھ مطابق ۲۸ / نومبر ۱۹۹۴ء بروز دوشنبہ ریاض میں ندوی حضرات کا ایک اجتماع منعقد ہوا جس میں اکثر ندوی ساتھیوں نے شرکت کی، مدارس سے دلچسپی رکھنے والے کچھ اور احباب بھی اس میں شریک ہوئے، سب نے تجاویز کی روشنی میں مندرجہ ذیل قراردادیں پاس کیں :

۱- ۲۱ / نومبر کی رات ندوہ میں جو کاروائی کی گئی وہ کئی لحاظ سے قابل اعتراض ہے، اس طرح کی کاروائی جتنی بھی ضروری ہو، اس کے لئے یقینی شواہد کا ہونا، پھر ان کی بنیاد پر کوئی قدم اٹھانے سے قبل ریاستی انتظامیہ کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ نیز ایک انتہائی قابل احترام، عالمی شہرت رکھنے والے، پر امن فضا کی طرف دعوت دینے والے دینی ادارے پر ایسی کاروائی کرتے ہوئے ندوہ کے ذمہ داروں کو بھی اعتماد میں لینا ضروری تھا، یہ ادارہ اس قدر خطرناک تصور کیا گیا کہ وہاں وہ اقدام کیا گیا جو ملک دشمن عناصر کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ امن وامان کے ذمہ دار اداروں میں مسلم دشمن عناصر کی پھیلائی ہوئی افواہیں جگہ پا چکی ہیں۔

ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں :

A۔ ایک عدالتی تحقیقاتی کمیشن کے ذریعہ اس واقعے کی مکمل جانچ کروائے اور تحقیقات کے نتائج کو مشتہر کرے اور جو حضرات اس واقعہ کے ذمہ دار ہوں ان کے خلاف کاروائی کرے۔

B۔ اس طرح کا واقعہ پھر نہ دہرایا جائے، اس کیلئے حکومت قانون کے ذریعہ مدارس کو تحفظ فراہم کرے، ان کے احترام کی ضمانت دے، اور ایسا کوئی اقدام کرنے سے پہلے وہاں کے ذمہ داروں کو پہلے سے اعتماد میں لے، حکومت کے اس واقعہ سے ندوہ کو جو مالی واخلاقی نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کرے، حکومت ان صحافیانہ رپورٹوں کا جائزہ لے جو افواہوں کو یقینی لہجہ میں پیش کرتی ہیں، اور ان اخباروں کے خلاف کاروائی کرے جو ندوۃ العلماء اور دوسرے دینی مدارس پر وہ الزام لگاتے ہیں جو کسی تخریب کار، ملک دشمن پر لگایا جا سکتا ہے۔

۲- اجتماع کے شرکاء ندوہ کے تحفظ اور اس کی حرمت پر جو آنچ آئی ہے اس سے آزردہ دل ہیں، اور وہ ندوہ اور دیگر مدارس کے تحفظ کو ملت کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے ہیں اور ندوہ کے ذمہ داروں کے ساتھ ہمہ جہت تعاون کو اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی یہ محسوس کرتے ہیں کہ ندوہ پر یہ حملہ محض ملت کی دینی وتعلیمی شناخت پر حملہ ہے جس کو ہر ممکن طرح سے ناکام بنانا ضروری ہے۔

۳- ہم ریاستی حکومت کی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ وہ ریاستی حدود میں ایسے قیمتی اداروں کے تحفظ کی ذمہ داری انجام دے اور مسئلہ کو سیاسی رنگ سے بالاتر ہو کر دیکھے اور واقعی اقدامات کر کے دکھائے۔

۴- ہم اہل وطن کو یہاں یہ یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ انسانی معاشرہ صرف طاقت کے سہارے قائم نہیں رہتا ہے، کوئی فیصلہ حقائق سے مکمل طور پر آگاہ ہوئے بغیر کرنا ظلم کی راہ پر چلنا ہے، اس لحاظ سے ان کو عدل کا نہ صرف ساتھ دینا چاہئے بلکہ ظلم کے پھیلانے والوں کی راہ میں کھڑا ہو جانا چاہئے کیونکہ اس طرح ظلم کا نشانہ صرف چند لوگ نہیں بنتے ہیں بلکہ اس کی تباہی پورے معاشرے کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ہم اس دعاء کے ساتھ یہ قرارداد ختم کرتے ہیں کہ اللہ ہم کو حق کا علمبردار بنائے اور ظلم کے سامنے ڈٹ جانے والا بنائے اور ہم کو ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے والا بنائے۔ (آمین)

ریاض میں میری موجودگی یعنی اگست ۲۰۰۰ء تک تو یہ تنظیم کام کرتی رہی، اور اس نے متعدد سیمینار اور جلسے ریاض میں منعقد کرائے، اور ندویوں اور ندوہ کے درمیان رابطہ کا کام دیتی رہی لیکن میرے آنے کے بعد اس کی کارکردگی تقریباً ختم ہوگئی۔

سعودی عرب---چند قابل غور پہلو

سعودی عرب کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ وہ ملک ہے جہاں کتاب وسنت کی حاکمیت ہے، اسی کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں، لیکن اس میں حقیقت کم اور پروپگنڈا زیادہ ہے، اور جو اسلامی قانون نافذ ہیں ان پر بھی پوری طرح عمل نہیں ہوتا، اسلامی قوانین کا بڑا شہرہ ہے لیکن سوائے پرسنل لا اور چند حدود وتعزیرات کے اور کوئی اسلامی قانون نافذ نہیں، پہلی بار ۱۹۷۷ء میں جب میں نے کسی سے یہ سنا کہ یہاں کے بینکوں میں سودی نظام رائج ہے تو میں نقش حیرت بن کر رہ گیا اور مجھے اس پر یقین نہیں آیا، مگر جب مزید لوگوں نے اس کی تصدیق کر دی اور بعض سعودی علماء کے مقالات پڑھے تو یقین کرنا ہی پڑا کہ واقعی یہاں کے بینکوں میں سودی نظام رائج ہے ؎

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرہ خون نکلا

۱۔ یہاں کے سرکاری دارالافتاء کے فتوی کے مطابق یہاں تمباکو کا استعمال حرام ہے خواہ سگریٹ ہو، پائپ ہو، حقہ ہو، یا کھانے والی تمباکو ہو، لیکن اس کے باوجود سب چیزیں یہاں وافر موجود ہیں، دیندار دکاندار البتہ کسی قسم کوئی سگریٹ یا تمباکو نہیں فروخت کرتے۔ اسی طرح تصویر کا کھینچنا حرام ہے لیکن حکومت نے خود ہر سرکاری فارم وغیرہ پر تصویر لگانا لازمی کر رکھا ہے۔

۲۔ ڈش انٹینا کا استعمال بھی یہاں فتوی کے مطابق حرام ہے لیکن اس کے برآمد کرنے یا خرید و فروخت کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔

۳۔ اسلامی مساوات کے بلند دعوے ہیں، مگر اسلامی مساوات کا دور دور پتہ نہیں، یہ خامی اگر عوام میں ہوتی، پرائیوٹ کمپنیوں میں ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ حکومت کے اختیار سے باہر ہے، حکومت ان پر کنٹرول نہیں کر سکتی، لیکن یہ تمام چیزیں سرکاری اداروں میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر چند باتیں پیش خدمت ہیں :

ا۔ تنخواہوں کے گریڈ مختلف اداروں یا محکموں میں مختلف ہیں، عام طور پر چار گریڈ ہیں :
سعودی، عربی، غربی، شرقی۔
سب سے زیادہ تنخواہ مغربی یعنی امریکی، برطانوی، جرمنی، فرانسیسی اور دیگر مغربی ممالک کے

افراد کی ہے۔ دوسرے نمبر پر سعودی کی تنخواہ ہے، تیسرے نمبر پر دیگر عرب ممالک کے افراد کی تنخواہ ہے، سب سے کم اور چوتھے نمبر پر ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی، فلپائنی اور دیگر مشرقی ممالک کے افراد کی ہے، اس میں کوئی تخصیص مسلم یا غیر مسلم ہونے کی کسی بھی مرحلہ میں نہیں ہے، اگر یہ فرق مسلم غیر مسلم کی بنیاد پر ہوتا جب بھی گوارا ہوتا جس طرح دیت کا مسئلہ ہے کہ سب سے زیادہ دیت مسلمان کی پھر عیسائی اور یہودی کی، پھر مشرک اور کافر کی ہے۔

اسی طرح سالانہ یا دو سالہ چھٹیوں کا مسئلہ ہے، سب سے زیادہ چھٹیاں سعودیوں کی ہیں، دوسرے نمبر پر عربوں کی ہیں، تیسرے نمبر پر غربیوں کی ہیں اور سب سے کم شرقیوں کی ہیں، یعنی دو سال میں ایک ماہ کی چھٹی اور دو سال بعد اپنے ملک جانے کا ہوائی ٹکٹ جبکہ دوسروں کی چھٹیاں ایک سال میں کم سے کم ۳۰، یا ۴۵ دن ہوتی ہیں، ٹکٹ سال میں ایک بار اور امریکیوں کو سال میں دو بار ٹکٹ ملتا ہے۔

۴۔ بعض حکومتی اداروں میں کم درجہ کے ملازمین کو جو کسی کنٹریکٹر کے ماتحت ہوتے ہیں ان کو تین سو چار سو ریال صرف دیئے جاتے ہیں اور یہ بات حکومت کے ذمہ دار بھی جانتے ہیں اس کے باوجود کنٹریکٹر کو کچھ نہیں کہتے، الٹا حکومتی اداروں کے بعض بد بخت ملازم تو ان کا بھی استحصال اسطرح کرتے ہیں کہ ان سے اپنے گھروں پر اجرت متعین کر کے کام لیتے ہیں اور وعدہ خلافی کر کے تھوڑے بہت پیسے دے کر چلتا کر دیتے ہیں اگر کوئی تقاضہ کرے تو پولیس سے پکڑوانے کی دھمکی دیتے ہیں، کیونکہ قانونی طور پر دوسری جگہ کام کرنا جرم ہے۔

۵۔ پرائیوٹ اداروں کا حال سرکاری اداروں سے بھی خراب ہے، یہ ہندوستانیوں، پاکستانیوں وغیرہ کو طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں مثلاً سال سال بھر ان کی تنخواہیں نہیں دیتے، کبھی ان کے تمام حقوق ہضم کر لیتے ہیں، بلکہ بعض کمپنی کے ضمیر فروش مالک تو الٹا کوئی الزام لگا کر اپنے ملازم کو جیل میں ڈلوا دیتے ہیں تا کہ اس کے مالی حقوق انھیں نہ دینا پڑیں۔

۶۔ بہت سے کفیل اپنے مکفول کو کئی کئی ماہ تنخواہیں نہیں دیتے، صرف کھانے پینے کے لئے دو سو تین سو ریال دیتے رہتے ہیں، بعض معمولی کمپنیوں نے یہ طریقہ اپنا رکھا ہے کہ کئی سال کی تنخواہ اپنے پاس جمع رکھتے ہیں کہ تا کہ آدمی کہیں جا نہ سکے، جب پیسوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے

تو کہتے ہیں گھر جاتے وقت لے لینا اور جب گھر جانے کا وقت آتا ہے جب بھی اس کے پیسے نہیں دیتے بلکہ خروج لگا دیتے ہیں تا کہ واپس آ کر پیسے نہ مانگے، پھر دوسرا کوئی نیا آدمی رکھ لیتے ہیں اور اسکے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں، دوسروں کا حق مار کا اس طرح گویا بچت کرتے ہیں، دلوں سے جب خوف خدا ختم ہو جائے اور ضمیر بے حس یا مردہ ہو جائے تو انسان یہی کچھ کرتا ہے۔

۷۔ ڈرائیوروں اور خادماؤں کا ایک اور معاملہ بھی یہاں قابل غور ہے، اگر کفیل دیندار نہیں، یا زیادہ مالدار ہے اور اتنے بڑے گھر کا مالک ہے جہاں ایک کمرے والے کو دوسرے کمرے والے کی خبر نہیں ہوتی وہاں عموماً اس کے لڑکے خادمہ کو بیویوں کی طرح اور لڑکیاں ڈرائیوروں کو شوہر کی طرح استعمال کرتے ہیں، الا ما شاء اللہ، اگر ڈرائیور یا خادمہ راضی نہیں تو زبردستی یا دھمکی سے ایک بار مقصود حاصل کر لیا جاتا ہے، اس کے بعد آئندہ کے لئے راستہ صاف ہو جاتا ہے، اگر اس دوران کوئی خادمہ حاملہ ہو جائے تو اس کو اپنے ملک واپس بھیج دیا جاتا ہے، اس میں مسلم، غیر مسلم، عیسائی ہندو خادمہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہندوستانی سفارتخانے کے لوگوں نے بتایا کہ وہاں خادمائیں یہ شکایت لے کر آتی رہتی ہیں، اب کئی سالوں سے ہندوستانی حکومت نے خادماؤں کے جانے پر پابندی لگا دی ہے، مگر پھر بھی ایجنٹ خواہشمند عورتوں کو کسی نہ کسی طرح ویزا لگوا کر جہاز میں سوار کرا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے ملکوں سے خاص طور پر فلپائن، انڈونیشیا وغیرہ سے بھی خادماؤں سے بھری فلائٹیں آتی رہتی ہیں۔

۸۔ بعض سعودی اتنے بدبخت ہیں کہ خود ہی اجتہاد کر لیتے ہیں اور خادماؤں کو لونڈیاں اور باندیاں قرار دے کر ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں، دن میں ان سے اپنی ہانڈیاں گرم کرواتے ہیں اور رات میں پہلو گرم کرواتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ لونڈیوں کے حکم میں ہیں کیونکہ ہم ان کے ہر چیز کے ذمہ دار ہیں، کھانا پینا، رہنا، سہنا دوا علاج اس لئے وہ لونڈی ہیں ہم کو انھیں ہر طرح سے استعمال کرنے کا حق ہے۔

اسی طرح گھر کی عورتیں غیر ملکی ڈرائیور کو دھمکا کر یا روپیہ پیسے کا لالچ دے کر ایک بار اپنا مطلب

حاصل کر لیتی ہیں، اور پھر یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اسطرح کے کئی واقعات کئی لوگوں نے خود مجھے سنائے۔

۹۔ چونکہ یہاں اجتماعی طور پر کئی خاندانوں کا ایک ساتھ رہنے کا رواج ختم ہو گیا ہے اس لئے نئے شادی شدہ لڑکے کو الگ مکان لے کر اپنی بیوی کو اس میں رکھنا پڑتا ہے، مکانات بہت گراں ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ مہر بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اس لئے درمیانہ طبقہ اور غریب طبقہ نہ شادی کر سکتا ہے اور نہ مکان خرید سکتا ہے، اس لئے وہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہے اور سال بھر بچت کرتا ہے، پھر سالانہ چھٹی میں اپنی جنسی پیاس بجھانے کے لئے سعودی عرب سے باہر کا رخ کرتا ہے، ائرپورٹ پر پہنچتے ہی مردوں کا لباس پینٹ شرٹ ہو جاتا ہے اور عورتوں کے جسم سے برقع اتر جاتا ہے۔ عربوں کے لئے سب سے بڑا عیاشی کا اڈا پہلے بیروت تھا، اس کی تباہی کے بعد اب بحرین ہے جہاں کھلے عام شراب فروخت ہوتی ہے اور رقص وسرود کی محفلیں جمتی ہیں، جن کے پاس روپیہ کچھ زیادہ ہوتا ہے وہ عیاشی کے لئے مصر، انڈونیشیا، ملیشیا، سنگاپور، فلپائن نکل جاتے ہیں، اور وہاں سے تازہ دم ہو واپس کر آتے ہیں، اور ایک دوسرے سے فخریہ بیان کرتے ہیں، غیر دینداروں میں یہ ایک عام سی بات ہے۔

۱۰۔ ایسا لگتا ہے کہ زنا اور لواطت سعودی معاشرہ میں عام ہے اسی لئے ائمہ مساجد ہر خطبہ میں ان دونوں کی برائی اور شناعت بیان کرتے ہیں اور ان دونوں کے ختم ہونے کی دعا مانگتے ہیں۔

۱۱۔ ۱۹۷۷ء میں یہاں مقیم ہر فرد اپنی بیوی بچوں، والدین بہن بھائیوں کو بلا سکتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد یہ سہولت ختم کر دی گئی، اب یہاں مقیم صرف وہی شخص اپنی بیوی بچوں کو بلا سکتا ہے جو بی-اے پاس ہو یا ہائی اسکول پاس ہو لیکن ساتھ میں کوئی ٹیکنکل ڈپلومہ بھی ہو، اور تنخواہ تین ہزار ریال یا اس سے سے زائد ہو اور فیملی کی رہائش کا انتظام ہو، یا کفیل ہاؤس الاؤنس دیتا ہو۔ اس وجہ سے غیر ملکیوں میں، خاص طور پر فلپائنیوں اور دیگر ایشیائی ممالک کے لوگوں میں بھی اخلاقی کرپشن موجود ہے، مرد و عورت فون پر کوئی جگہ طے کر لیتے ہیں اور خاموشی سے فارغ ہو کر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔

۱۲۔ چند سالوں سے سعودی معاشرہ میں چوری، ڈکیتی، رشوت، بے ایمانی، دھوکی بازی عام ہوتی

جا رہی ہے۔ چوری میں کاروں کی چوری سرفہرست ہے، کار چرا کر یا اس کے بعض بڑے پرزے یا ٹائر وغیرہ نکال لئے جاتے ہیں اور گاڑی کہیں ویرانہ میں چھوڑ دی جاتی ہے، یا گاڑی کو ہفتہ عشرہ بری طرح استعمال کر کے کہیں چھوڑ دی جاتی ہے، ہمارے ایک پڑوسی کی گاڑی چوری ہوئی، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کی گاڑی چوری ہوئی، محمد نعمان ندوی کی گاڑی چوری ہوئی، اقبال کیلانی گاڑی سے عمرہ کرنے مکہ مکرمہ گئے وہاں سے انکی گاڑی چوری ہوئی۔

۱۳- غیر ملکیوں سے تعصب اور سعودی کی جانبداری خواہ غلطی سعودی ہی کی کیوں نہ ہو، روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، ٹریفک حادثہ ہو یا عدالت کا کمرہ ہو، ہر جگہ غیر ملکیوں کے ساتھ تعصب بڑھتا جا تا ہے، یہاں تک کے گھر اور بازاروں سے غیر نمازیوں کو پکڑنے میں بھی جانبداری برتی جاتی ہے، آج تک کوئی سعودی نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے نہیں پکڑا گیا، پکڑا جا تا ہے تو ہندستانی، بنگلہ دیشی، پاکستانی۔ امام صاحب لوگوں کو جماعت سے نماز پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن یہ تلقین عملی طور پر غیر ملکیوں کے لئے ہوتی ہے، مقامی لوگ اس سے مستثنی ہوتے ہیں، اسی لئے ان کی گرفت نہیں ہوتی۔

۱۴- رشوت خوری عام ہوگئی ہے جو کام نہ ہوتا ہو وہ رشوت دے کر با آسانی ہو جاتا ہے۔

۱۵- منشیات ومخدرات عام ہو رہی ہے، اس کی اسمگلنگ میں پاکستانی اور سرحدی پٹھان زیادہ ملوث ہیں اور منگوانے والے سعودی ہیں۔

۱۶- اخلاقی گراوٹ دن بدن بڑتی جا رہی ہے، اس میں خود پولیس والے بھی ملوث ہیں، سنا ہے کہ کم عمر غیر سعودی لڑکوں کو اقامہ نہ ہونے کے بہانے پکڑ کر لیجاتے ہیں اور ان کے والدین سے سو دو سو ریال اینٹھتے ہیں پھر چھوڑتے ہیں۔

۱۷- بطحاء کے **البنك الاهلی التجاری** میں دن دھاڑے بارہ بجے چند مسلح افراد آئے اور ساٹھ ہزار ریال لے کر گاڑی میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گئے اور مجرم پکڑے نہ جا سکے۔

۱۸- جدہ میں کئی بینکوں میں ڈکیتی کی وارادات ہوئی، اس کے علاوہ سونے کی دکانوں میں بھی کئی بار چوری اور ڈکیتی کی وارادات ہوئی۔

افسوناک بات یہ ہے کہ جدہ شہر میں یہ خرابیاں سب سے زائد ہیں، لوگوں کو زبردستی پکڑ لیتے

ہیں اور کچھ لے کر چھوڑ دیتے ہیں، غیر قانونی طور پر مقیم اگر ملک سے باہر جانا چاہتا ہے تو ایک جگہ مقرر ہے، مقرر روپئے دے کر وہاں پہنچ جایئے تو وہاں سے پکڑ کر، ٹکٹ کا انتظام کر کے اسے اسکے ملک واپس بھیج دیا جائے گا۔ سعودی عرب میں غیر قانونی طور پر رہنے والے حضرات اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۱۹- ہر طرح کے جرائم، چوری، لوٹ مار، قتل، زنا بالجبر وغیرہ پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گئے ہیں، اس کا اندازہ یوں کریں کہ ریاض میں پہلے ایک ہفتہ میں صرف ایک شخص پر حد نافذ ہوتی تھی وہ بھی صرف جمعہ کے روز، اب ہفتہ میں اوسطاسات افراد پر حد نافذ ہوتی ہے، اب جمعہ کی تخصیص بھی باقی نہیں رہی بلکہ کسی دن بھی ہو سکتی ہے۔

۲۰- بجلی کا استعمال اسراف کی حد تک بڑھا ہوا ہے، خواہ مسجد یا آفس، دوکان یا اسپتال ہر جگہ روشنی اور بجلی کا استعمال ضرورت سے زائد ہے، مثال کے طور پر میں محلے کی جس مسجد میں نماز پڑھتا ہوں وہ چھوٹی مسجد ہے اندر کے حصے میں چھ صفیں ہیں ہر صف ۴۰۔ آدمی آتے ہیں لیکن وہاں ۴۸، بڑے راڈ لگے ہیں اور ۸ لاؤڈ اسپیکر مسجد کے اندر اور آٹھ لاؤڈ اسپیکر مینارے پر لگے ہیں، یہی حال تقریباً تمام مسجدوں آفسوں، اور بینکوں کا ہے۔

۲۱- پہلے ہر نماز کے وقت پابندی سے ھیئۃ الامر بالمعروف والنھی عن المنکر کے افراد دوکانوں کو بند کرانے کے لئے آتے تھے۔ اب کوئی نماز کے لئے کہنے نہیں آتا، جب جی چاہے آپ دوکان بند کریں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ شارع عام پر ایک گاڑی لاؤڈ اسپیکر پر ’’صلوا صلوا‘‘ یا ’’الصلاۃ‘‘ ’’الصلاۃ‘‘ کہتے ہوئے گذر جاتی ہے۔

۲۲- مسجدوں کے باہر سعودی خواتین اور مرد کاغذ لئے کچھ نہ کچھ مانگتے نظر آتے ہیں، کیا حکومت غریب، پریشان حال بیمار، نادار افراد کے لئے ماہانہ وظیفہ کو کوئی بند بست نہیں کر سکتی یا کوئی بیت المال نہیں بنا سکتی جہاں سے ضرورت مندوں کو ماہانہ وظیفہ ملا کرے ؟

۲۳- پہلے یہاں ہر چیز اچھی اور اعلی درجہ کی ملتی تھی، اب ہر چیز نقلی ملنے لگی ہے، بلکہ نقلی کی بھی نقل، اور اسی کو اصل بتا کر فروخت کیا جاتا ہے۔

۲۴- پہلے جاپان، جرمن، امریکہ کا بہترین سامان ملتا تھا جو پائدار ہوتا تھا اب ہر چیز تائیوان، کوریا

، جاپان سے آرہی ہے اور قیمتوں میں زیادہ فرق نہیں ہے لیکن کوالٹی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلے آپ کوئی بھی چیز آنکھ بند کر کے خرید سکتے تھے، اب ہواش وحواس بجا ہوں جب ہی آپ مناسب پیسوں میں مناسب چیز خرید سکتے ہیں۔

۲۵- مہنگائی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، عراق ایران جنگ کا اتنا اثر سعودی عرب پر نہیں پڑا تھا جب کہ سعودی عرب عراق کا سب سے زیادہ تعاون کر رہا تھا، لیکن خلیج جنگ کے بعد تو جیسے مہنگائی نے یہاں کا راستہ دیکھ لیا، سب سے زیادہ مہنگائی کا اثر دودھ پر پڑا جو بچوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے، نیڈو دودھ جس کا آدھا کلو ڈبہ چار ریال کا تھا اس وقت وہی ڈبہ دس گیارہ ریال کا ہے۔

۲۶- ایسی چیزیں جو غیر ملکیوں سے متعلق ہیں ان میں اضافہ تو ناقابل بیان حد تک ہوا ہے، مثلاً ایک سال اقامہ کی فیس ۴۰ ریال تھی، پھر یکا یک ۱۵۰ ریال ہوگئی، اور اب مع لیبر کارڈ کے ۶۰۰ ریال ہوگئی، اسی طرح خروج عودہ ویزا کی فیس ۲۰ ریال تھی پھر ۱۰۰ ریال ہے۔ اسی طرح ویزا ٹرانسفر کرانے کی پہلے کوئی فیس نہیں تھی پھر ٹرانسفر ۱۰۰۰ ریال دوسرے پر ۲۰۰۰ ریال اور تیسرے پر ۳۰۰۰ ریال کر دی گئی، اور اب یہ دگنا ہوگئی ہے یعنی بالترتیب ۲۰۰۰-۴۰۰۰-۶۰۰۰ ریال ہوگئی ہے۔

۲۷- یکم جون ۱۹۹۹ء سے ائرپورٹ فیس ۵۰ روپئے بھی لاگو کر دی گئی ہے۔ جنگ خلیج سے پہلے کام کے ویزے کی کوئی فیس نہیں تھی، پہلے یہ ۱۰۰۰ ریال ہوئی پھر مئی ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۰ ریال ہوگئی۔ پہلے ملازم کے تمام تر سرکاری اخراجات (جن کا اوپر ذکر ہوا) اور آمد ورفت کے ٹکٹ کا ذمہ دار وہ ادارہ، کمپنی یا شخص ہوتا تھا جو ملازم رکھتا تھا، اب یہ تمام اخراجات خود ملازم کو خود برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

آیئے اب آپ کو ویزوں کے بارے میں بھی کچھ بتا دیں:

پہلے کام کا ویزا حکومت فری دیتی تھی، جب مختلف ممالک سے یہاں ملازمت کے لئے آنیوالے خواہشمندوں کی کثرت ہوگئی تو بعض صرف اقامہ لگوانے کا ذمہ دار ہوتا ہے اس بات سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ ویزا دینے والا شخص صرف اقامہ لگوانے کا ذمہ دار ہوتا ہے اس بات اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ اس کا مکفول کیا کرتا ہے، اور کہاں سے کھاتا ہے؟ چونکہ ویزا کی طلب زیادہ تھی اور جب تک کو کوئی کام نہ ملے اس وقت تک اس کا مہمان رہتا تھا، اس کو کوئی معقول جگہ مل جاتی تو وہ دو تین ہزار ریال

اپنے کفیل کو دے کر اپنا ویزا دوسرے کفیل کے نام ٹرانسفر کر لیتا تھا، اور عام مزدور طبقہ کے لوگ ویزا نہیں بدلواتے تھے بلکہ الٹا کفیل کو سالانہ کچھ ریال دے کر اپنا کام چلاتے تھے۔ یہی آزاد ویزا کہلاتا ہے۔

یہاں غیر ملکیوں، خاص طور پر ہندوستانیوں پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں کا بڑا استحصال کیا جاتا ہے، بعض لوگ اپنے نام ویزے ایشو کروا کے فروخت کر دیتے ہیں، ایسے افراد جب ملک کے اندر آجا تے ہیں تو وہ ادھر ادھر کام کرنے لگتے ہیں، ویزا فروخت کرنے والا ان سے ماہانہ یا سالانہ کچھ پیسے لیتا ہے کیونکہ قانونی طور پر وہ اسی کا ملازم ہوتا ہے، نہ دے تو جہاں کہیں بھی کسی قانونی کارروائی کی ضرورت پڑتی ہے وہ اس سے تعاون نہیں کرتا، اور حکومت ایسے شخص کو پکڑ کے ملک بدر کر دیتی ہے، اس سے ویزا خریدنے والے کا نقصان ہوتا ہے۔

کئی سال سے یہاں کا میڈیا مسلسل تارکین وطن کو ہٹانے اور مقامی لوگوں کو ان کو جگہ رکھنے کی خبریں دے رہا ہے، لیکن پرائیوٹ سیکٹر میں عملی طور پر مختلف مشاکل کیوجہ سے اس پر عمل نہیں ہو پا رہا ہے، اس کا ایک سب سے بڑا نقصان یہ وہ رہا ہے کہ غیر ملکوں کے خلاف سعودیوں میں نفرت کے جذبات ابھر رہے ہیں، اور ملکی تعصب بڑھ رہا ہے۔

☆☆☆

سعودی عرب---چند قابل اصلاح پہلو

یہاں کے بعض پرائیوٹ اداروں کا حال بہت خراب ہے، یہ ہندوستانیوں، پاکستانیوں وغیرہ کو طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں مثلاً سال سال بھران کی تنخواہیں نہیں دیتے، کبھی ان کے تمام حقوق ہضم کرجاتے ہیں، بلکہ بعض کمپنی کے ضمیر فروش مالک تو الٹا کوئی الزام لگا کر اپنے ملازم کو جیل میں ڈلوادیتے ہیں تاکہ اس کے مالی حقوق انھیں نہ دینا پڑیں۔

بعض کفیل اپنے مکفول کو کئی کئی ماہ تنخواہیں نہیں دیتے، صرف کھانے پینے کے لئے دوسوتین سو ریال دیتے رہے ہیں، بعض معمولی کمپنیوں نے یہ طریقہ اپنا رکھا ہے کہ کئی کئی سال کی تنخواہ اپنے پاس جمع رکھتے ہیں تاکہ آدمی کہیں جانہ سکے، جب پیسوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں گھر جاتے وقت لے لینا اور جب گھر جانے کا وقت آتا ہے جب بھی اس کے پیسے نہیں دیتے بلکہ خروج لگا دیتے ہیں تاکہ واپس آکر پیسے نہ مانگے، پھر دوسرا کوئی نیا آدمی رکھ لیتے ہیں اور اسکے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں۔

چونکہ یہاں اجتماعی طور پر کئی خاندانوں کا ایک ساتھ رہنے کا رواج ختم ہوگیا ہے اس لئے نئے شادی شدہ لڑکے کو الگ مکان لے کر اپنی بیوی کو اس میں رکھنا پڑتا ہے، مکانات بہت گراں ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ مہر بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اس لئے درمیانہ طبقہ اور غریب طبقہ نہ شادی کرسکتا ہے اور نہ مکان خرید سکتا ہے، اس سلسلے میں کبھی کبھی حکومت بعض افراد کی مدد کردیتی ہے۔

۱۹۷۷ء میں یہاں مقیم ہر فرد اپنی بیوی بچوں، والدین بہن بھائیوں کو بلا سکتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد یہ سہولت ختم کردی گئی، اب یہاں مقیم صرف وہی شخص اپنی بیوی بچوں کو بلا سکتا ہے جو بی-اے پاس ہو یا ہائی اسکول پاس ہو لیکن ساتھ میں کوئی ٹیکنکل ڈپلومہ بھی ہو، اور تنخواہ تین ہزار ریال یا اس سے زائد ہو اور فیملی کی رہائش کا انتظام ہو، یا کفیل ہاؤس الاؤنس دیتا ہو۔ اس وجہ سے غیر ملکیوں میں، خاص طور پر فلپائنیوں اور دیگر ایشیائی ممالک کے لوگوں میں اخلاقی کرپشن موجود ہے۔

چند سالوں سے سعودی معاشرہ میں چوری، ڈکیتی، رشوت، بے ایمانی، دھوکہ بازی عام ہوتی جارہی ہے۔ شاید یہ ویڈیو فلم اور انٹرنیٹ کا اثر ہے۔

بجلی کا استعمال اسراف کی حد تک بڑھا ہوا ہے، خواہ مسجد یا آفس، دوکان یا اسپتال ہر جگہ روشنی

اور بجلی کا استعمال ضرورت سے زائد ہے۔

پہلے ہر نماز کے وقت پابندی سے ہیئۃ الامر بالمعروف والنھی عن المنکر کے افراد دوکانوں کو بند کرانے کے لئے آتے تھے۔ اب کوئی نماز کے لئے کہنے نہیں آتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ شارع عام پر ایک گاڑی لاؤڈ اسپیکر پر "صلوا صلوا" یا "الصلاۃ" "الصلاۃ" کہتے ہوئے گذر جاتی ہے۔

مسجدوں کے باہر سعودی خواتین اور مرد کاغذ لئے کچھ نہ کچھ مانگتے نظر آتے ہیں، کیا حکومت غریب، پریشان حال بیمار، نادار افراد کے لئے ماہانہ وظیفہ کا کوئی بندوبست نہیں کرسکتی یا کوئی بیت المال نہیں قائم کرسکتی جہاں سے ضرورت مندوں کو ماہانہ وظیفہ ملا کرے ؟

پہلے یہاں ہر چیز اچھی اور اعلیٰ درجہ کی ملتی تھی، اب ہر چیز نقلی ملنے لگی ہے، بلکہ نقلی کی بھی نقل، اور اسی کو اصل بتا کر فروخت کیا جاتا ہے۔

مہنگائی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، عراق ایران جنگ کا اتنا اثر سعودی عرب پر نہیں پڑا تھا جب کہ سعودی عرب عراق کا سب سے زیادہ تعاون کررہا تھا، لیکن خلیج جنگ کے بعد تو جیسے مہنگائی نے یہاں کا راستہ دیکھ لیا۔

کئی سال سے یہاں کا میڈیا مسلسل تارکین وطن کو ہٹانے اور مقامی لوگوں کو ان کو جگہ رکھنے کی خبریں دے رہا ہے، لیکن پرائیوٹ سیکٹر میں عملی طور پر مختلف مشاکل کی وجہ سے اس پر عمل نہیں ہو پارہا ہے، اس کا ایک سب سے بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ غیر ملکیوں کے خلاف سعودیوں میں نفرت کے جذبات ابھر رہے ہیں، اور ملکی تعصب بڑھ رہا ہے۔

❁❁❁

سعودی عرب---چند روشن وتابناک پہلو

ہر ملک میں اچھا، برا معاشرہ اور اچھے، برے افراد پائے جاتے ہیں، سعودی عرب بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، اگرچہ دوسرے ملکوں اور معاشروں کے مقابلہ میں یہاں کا معاشرہ اور افراد اب بھی کہیں زیادہ بہتر اور مثالی ہیں، شر کا پہلو کم اور خیر کا پہلو کہیں زیادہ ہے، اور یہ صرف ان چند اسلامی حدود وتعزیرات کی برکت کی وجہ سے ہے جن کی وہاں تنفیذ ہوتی ہے- اگر یہاں سارے اسلامی قوانین نافذ ہوتے تو روئے زمین پر اس سے بہتر اور مثالی کوئی ملک ہی نہ ہوتا- لیکن ادھر پانچ چھ سالوں سے وہاں بھی خیر کا پہلو کم ہوتا جا رہا ہے اور شر کا پہلو بڑھتا جا رہا ہے اور یہی فکر کی بات ہے، اگر ابھی سے اس کی روک تھام اور اصلاح کی کوشش نہ کی گئی تو دوسرے ملکوں میں اور سعودی عرب میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا، ایک اسلامی ملک ہونے کے ناطے، اور وہاں حرمین شریفین کی موجودگی کی وجہ سے وہاں کی معاشرتی اور سماجی برائیاں ایک دیندار مسلمان کو ؎

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

کے مصداق زیادہ کھٹکتی ہیں اور بری محسوس ہوتی ہیں۔

سعودی عرب کے بہت سے اصول وضوابط اور نظام قابل فخر اور لائق تقلید ہیں، حتی کے دنیا کے بڑے بڑے جمہوری ملک اپنی جمہوری آزادی کے باوجود اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، مثلاً :

۱- سعودی عرب دنیا کا واحد ملک ہے جس کا جھنڈا کبھی اور کسی وقت بھی سرنگوں نہیں ہوتا، دنیا کے ہر ملک میں کسی بڑی شخصیت مثلاً صدر یا وزیر اعظم کے مرنے پر اس کے سوگ میں وہاں کا جھنڈا سرنگوں کر دیا جاتا ہے لیکن سعودی عرب کا جھنڈا کبھی سرنگوں نہیں کیا جاتا، وہ ہمیشہ سر بلند رہتا ہے کیونکہ اس میں کلمہ طیبہ لا اله الا الله محمد رسول الله لکھا ہوا ہے۔

۲- سعودی عرب دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں کا امن وامان اب بھی قابل رشک ہے، اس جیسا امن وامان شاید دنیا کے کسی خطے میں موجود نہیں، رات میں کسی وقت بھی آپ جب چاہیں اور جس وقت چاہیں اور جہاں چاہیں بے خوف وخطر آ، جا سکتے ہیں، جگہ جگہ آپ کو پولیس کی گاڑیاں گشت کرتی ہوئی نظر آئیں گی اور اگر آپ کو کوئی ضرورت ہوئی تو اسے پورا بھی کر دیں گی، کوئی ہنگامی حالت ہو

اور آپ کو ٹیکسی وغیرہ نہ مل رہی ہو تو پولیس کی گاڑی خود آپ کو مطلوبہ جگہ تک پہنچا بھی دے گی۔

۳- سعودی عرب دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں شراب پر مکمل پابندی ہے حتی کہ وہاں کی فوج میں بھی شراب کی سپلائی نہیں ہوتی اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ صدر ضیاء نے بھی پاکستانی فوج میں شراب کی ممانعت کر دی تھی، معلوم نہیں اب بھی یہ پابندی وہاں باقی ہے یا ختم ہو گئی۔

۴- سعودیہ ایر لائن دنیا کی وہ تنہا ایر لائن ہے جسکی فلائٹوں میں نہ تو شراب دی جاتی ہے اور نہ بیچی جاتی ہے، اور نہ ہی کوئی سعودیہ کے حدود کے اندر شراب لے کر آ سکتا ہے، حتی کہ ہومیو پیتھک دواؤں کا لیجانا بھی منع ہے کیونکہ اس میں الکوحل ہوتی ہے۔ مہذب اور صاحب کردار لوگ سعودیہ ایر لائن سے سفر کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ دوسری ایر لائنوں کی طرح اس میں گھٹن، اور مچھلی بازار جیسا ماحول نہیں ہوتا، جہاز کے اندر شراب کی خرید وفروخت، اور مے نوشی کی وجہ سے، ہر طرف بدبو، گھٹن، گالی گلوچ، دھینگا مشتی اور بدتمیزی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے، اور کبھی کبھی مے خواروں کی ائیر ہوسٹسوں کے ساتھ بدتمیزی اور دست درازی تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ دوسری ایر لائنوں میں سفر کرتے ہوئے عجیب طرح کی وحشت، گھٹن اور تاریکی کا احساس ہوتا ہے، جبکہ سعودیہ ایر لائن میں صاف ستھرا، مہذبانہ اور شریفانہ ماحول ہوتا ہے اور ایک عجیب طرح کے اطمینان وسکون کا احساس ہوتا ہے۔ صدر ضیاء الحق نے بھی پی-آئی-اے (PIA) کی فلائٹوں میں شراب کی سپلائی بند کرا دی تھی، معلوم نہیں وہاں یہ پابندی باقی ہے یا ختم ہو گئی ؟

۵- عرب اور اسلامی ملکوں میں سعودیہ ایر لائن دنیا کی وہ تنہا ایر لائن ہے جس کی فلائٹوں میں روانگی کی دعاء سفر باقاعدہ اتنی صاف اور واضح الفاظ میں پڑھی جاتی ہے کہ اگر کوئی پڑھنا چاہے تو اسی کو سن کر خود بھی پڑھ لے، دعاء کے پڑھنے سے ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے، اور جہاز کے اندر کا ماحول اسلامی اور ذہنی سکون کا باعث ہوتا ہے۔

۶- زندگی کی بہت سی بنیادی سہولتیں ہر ملکی اور غیر ملکی کو بلا امتیاز حاصل ہیں جن کا تصور ہندوستان میں ناممکن ہے، مثلاً بجلی کا بل ہو یا فون کا بل، پانی کا بل ہو یا کسی اور چیز کا بل، آپ کسی بھی بینک میں، اور کسی بھی برانچ میں اور کسی بھی محلّہ یا شہر میں جمع کر سکتے ہیں، اسی طرح خروج وعودہ کی فیس ہو یا ائیر پورٹ ٹیکس کی رقم ہو، کسی بھی بینک کی کسی بھی برانچ میں جمع کی جا سکتی ہے۔

۷- اپنے محلّہ اور شہر کے بینک میں جمع کیا ہوا روپیہ سعودیہ کے کسی بھی شہر میں، کسی بھی بینک سے اور کسی

بھی برانچ سے کسی بھی وقت، خودکارمشین (ATM) کے ذریعے چندمنٹوں میں نکالا جاسکتا ہے خواہ دن ہو یارات ہو، تعطیل کا دن ہو یا کام کا دن ہو۔

۸- سڑکوں کا نظام بہت اچھا ہےاور پورے سعودی عرب میں پھیلا ہوا ہے، سڑکیں اتنی صاف ستھری، ہموار اور چوڑی ہیں کہ ہندوستان میں بیٹھ کر ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بڑے شہروں کی سڑکیں اور خصوصاً ہائی وے High Way اتنی چوڑی ہیں کہ ان پر رن وے Run Way کا گمان ہوتا ہے، ایک ایک سڑک میں تین تین، چار چار Track ہیں، جن میں گاڑیاں مقررہ رفتار سے چلتی ہیں۔ ریاض، جدہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، طائف جیسے بڑے اور مرکزی شہروں میں کمپیوٹر کے ذریعہ ٹریفک کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اور کوئی حادثہ وغیرہ ہونے پر ٹریفک پولیس فوراً پہنچ جاتی ہے، شہر کے اندر بھی گاڑیاں ۸۰ اور ۱۰۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں، اس لئے تنبیہ کیلئے حکومت کی طرف سے عام سڑکوں پر اور خصوصاً ہائی وے پر مختلف قسم کے بورڈ لگادیئے گئے ہیں جن میں مناسب اسپیڈ سے گاڑی چلانے کی ترغیب دی گئی ہے، اور تیز رفتاری کے بھیانک نتائج سے ڈرایا گیا ہے، مثلاً چند بورڈوں کی عبارتیں یہ ہیں :

''لاتسرع فإن الموت أسرع'' (جلدی نہ کرو کیونکہ موت تم سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے)

''السرعة موت محقق'' (تیز رفتاری میں موت یقینی ہے)

''السيارة اداة نقل لا وسيلة قتل'' کار نقل وحمل کا ذریعہ ہے نہ کہ آلۂ قتل)

''كرسي القيادة أم سرير في المستشفى''

(ڈرائیونگ سیٹ پسند ہے یا اسپتال کی چارپائی)

''يا ابي لا تسرع ، وعدالينا سالما، نحن بانتظارك''

(اباجان جلدی نہ کریں اور ہمارے پاس صحیح سالم لوٹ کر آئیں، ہم آپ کے منتظر ہیں)

'' في التاني السلامة، وفي العجلة الندامة''

(میانہ روی میں سلامتی ہے اور تیز رفتاری میں پشیمانی ہے)

اس کے علاوہ سڑک کے دونوں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بورڈ ایسے بھی نظر آئیں گے جن میں ''اذكر الله ، أشكر الله، أستغفر الله، الحمد لله'' وغیرہ لکھا ہوا ہے تاکہ مسافر

سعودی عرب میں تیئیس سال

سفر میں بھی ذکر اللہ میں مشغول رہے۔

ایک کمی البتہ محسوس ہوتی ہے کہ اب تک پورے سعودیہ میں ٹرین کا انتظام نہیں ہوسکا، صرف ریاض سے دمام اور دمام سے ریاض تک ٹرین آتی جاتی ہے، اگر پورے سعودیہ میں ٹرینوں کا جال بچھا دیا جائے تو حکومت کی آمدنی بھی بڑھ جائے اور عوام کو بھی سہولت ہوجائے، اور اخراجات میں بھی کمی ہوجائے، ہوائی جہاز کا سفر بہت گراں پڑتا ہے اور ٹیکسی یا بس کا سفر تھکا دینے والا ہوتا ہے۔

۹- بجلی شاید ہی سال میں کبھی جاتی ہو، اور جاتی بھی ہے تو بہت کم وقفہ کے لئے، اور اگر کوئی لائن یا ٹرانسفارمر وغیرہ کی تبدیلی کا کام ہوتا ہے تو پہلے سے اخباروں میں اطلاع دیدی جاتی، اور یہ کام بھی چند گھنٹوں کے اندر پورا کرلیا جاتا ہے۔

۱۰- فون کی لائن کبھی خراب نہیں ہوتی، بالفرض اگر خراب ہوجائے تو آپ فون کردیں، ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر آپ کی لائن درست ہوجائے گی۔

۱۱- جمعہ کی نماز ہر مسجد میں نہیں ہوتی بلکہ صرف بڑی اور متعین مسجدوں ہی میں ہوتی ہے ان کو جامع کہا جاتا ہے، جمعہ کی اذان تقریباً دس بجے ہوجاتی ہے، جو اس بات کا اعلان ہے کہ اب ہر طرح کا کاروبار بند کردیا جائے اور جمعہ کی نماز کی تیاری کی جائے۔

۱۲- ہر مسجد میں عموماً تہجد کی اذان ہوتی ہے، اور ہر نماز اول وقت میں پڑھی جاتی ہیں، ساری مسجدوں میں ایک ہی وقت میں نماز ہوتی ہے اگر آپ کی نماز ایک مسجد میں چھوٹ گئی تو دوسری مسجد میں بھی آپ کو جماعت ملنا مشکل ہے، جمعہ کے علاوہ عام نمازوں میں پہلی جماعت کے بعد بھی لوگ آتے رہتے ہیں اور جماعتیں ہوتی رہتی ہیں۔ فرض نماز کے بعد ہندوستان کی طرح اجتماعی دعا نہیں ہوتی، لیکن لوگ انفرادی طور پر کچھ نہ کچھ وظائف پڑھتے رہتے ہیں اس کے بعد ہی سنت ونفل میں مشغول ہوتے ہیں۔

۱۳- پنجوقتہ اذان ہوتے ہی تمام دکانیں بند کردی جاتی ہیں۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی دو رکعت نماز تحیۃ المسجد پڑھنے کا عام رواج ہے سنتیں بھلے ہی نہ پڑھیں، ہر نماز میں جماعت سے پہلے جو افراد مسجد پہنچ جاتے ہیں وہ تحیۃ المسجد یا سنت کے بعد قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہوجاتے ہیں اور جماعت ہونے تک پوری مسجد تلاوت قرآن پاک کی آوازوں سے گونجتی رہتی ہے۔

۞۞۞

مجمع ملک فہد کا قیام اور حرمین شریفین کی توسیع

سعودی دور حکومت میں ملک خالد کا زمانہ ''عہد زریں'' کہلانے کا مستحق ہے، لیکن ملک فہد کے دور میں تین ایسے عظیم کارنامے انجام پائے جو تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں، ان تینوں کارناموں نے ملک فہد کو ساری دنیا کے مسلمانوں میں روشناس کرادیا۔ یہ ملک فہد کے ایسے قابل فخر کارنامے ہیں جس کے لئے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں، ایک تو ''مجمع ملك فهد لطباعة المصحف الشريف'' کا قیام، دوسرے حرم مکی کی عمارت کی توسیع وتعمیر اور تزئین اور تیسرے حرم مدنی کی عمارت کی توسیع وتعمیر اور تزئین۔

مجمع ملک فہد

مجمع ملک فہد کا پورا نام ''مجمع ملك فهد لطباعة المصحف الشريف'' ہے، اس کا قیام دراصل قرآن شریف کے ترجمہ وتفسیر، اس کی طباعت وریکارڈنگ کے لئے عمل میں لایا گیا ہے، جہاں سے ان کو ملک وبیرون ملک سعودی سفارتخانوں کے ذریعے یا دوسرے ذرائع سے پوری دنیا کے ملکوں میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے ہیں۔

مجمع ملک فہد میں درج ذیل امور انجام پاتے ہیں:

۱- یہاں مختلف حجم اور کاغذ کے اعتبار سے مختلف کوالٹی کے قرآن شریف معری، مترجم اور مع تفسیری حواشی چھاپے جاتے ہیں۔

۲- دنیا کی مختلف ومتعدد زبانوں میں قرآن شریف کا ترجمہ کرایا جاتا ہے یا پہلے سے موجود کوئی معتبر ترجمہ چھاپا جاتا ہے اور مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔

۳- دنیا کی مختلف ومتعدد زبانوں میں قرآن شریف کی تفسیر لکھوائی جاتی ہے یا پہلے سے موجود کسی معتبر تفسیر کو چھاپا جاتا ہے اور مفت تقسیم کیا جاتا ہے، مثلاً ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لئے دو ترجمے مع تفسیری حواشی شائع کئے گئے اور سعودی عرب کے اندر اور باہر ہندوستان پاکستان وغیرہ میں تقسیم کئے گئے۔ ایک تو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا ترجمہ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے تفسیری حواشی، دوسرا مولانا محمدؒ جونا گڑھی کا ترجمہ

سعودی عرب میں تیئیس سال

اور مولانا صلاح الدین یوسف صاحب کے تفسیری حواشی۔

معلوم ہوا ہے کہ یہ مجمع ۴۵ زبانوں میں قرآن پاک کے معانی وترجمے کے ساتھ شائع کرتا ہے۔

۴- ملک وبیرون ملک کے مشہور اور اچھے قاریوں کی تلاوت کیسٹوں میں ریکارڈ کی جاتی ہے مثلاً قاری عبدالباسط، قاری علی بن عبدالرحمٰن الحذیفی، قاری محمد ایوب بن محمد یوسف وغیرہ اور پھر یہ کیسٹ اندرون ملک وبیرون ملک مفت تقسیم کئے جاتے ہیں، اس طرح دوسرے ملکوں کے مسلمان بھی سعودی عرب کے اس ادارہ سے مستفید ہوتے ہیں۔

مجمع ملک فہد نے ۱۴۰۵ھ سے جمادی الثانی ۱۴۲۶ھ تک قرآن پاک کے ۲۰ کروڑ سے زائد نسخے شائع کئے ہیں جس میں سے ۱۸ کروڑ ۶۰ لاکھ نسخے تقسیم کئے جاچکے ہیں۔ یہ ادارہ ۲ لاکھ ۵۰ ہزار مربع میٹر پر محیط ہے، اور سالانہ ایک کروڑ نسخے تیار کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

حرمین شریفین کی توسیع

حرمین شریفین کی ابتک کی تمام توسیعات میں ملک فہد بن عبدالعزیز کی توسیعات کو سب سے زیادہ امتیاز حاصل ہے، اس توسیع کو نہ صرف رقبہ کے اعتبار سے بلکہ مضبوطی اور خوبصورتی کے اعتبار سے بھی تمام توسیعات پر فوقیت حاصل ہے۔

حرمین شریفین کی توسیع میں ملک فہد بن عبدالعزیز نے عہد جدید کے تقاضوں اور ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بہترین ساز وسامان اور ماہرین تعمیرات کی اعلی ترین صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اس کی تعمیر وتزئین کے لئے وہ سب کچھ کیا جس کی ضرورت تھی، اور اس مبارک کام میں پانی کی طرح روپیہ خرچ کیا، سننے میں یہ آیا کہ انھوں نے یہ کہہ رکھا تھا حرمین شریفین کی تعمیر وتوسیع میں جو بھی اخراجات ہوں وہ بلا کسی تردد کے آنکھیں بند کرکے ادا کئے جائیں۔ یہ تمام تعمیر وتوسیع اور تہذیب وتزئین بن لادن گروپ (کمپنی) کی نگرانی میں کرائی گئی ہے، جو حرمین شریفین سے غیر معمولی دلچسپی اور روحانی لگاؤ وعقیدت کے لئے مشہور ہیں، انھوں نے اپنی ذاتی وخصوصی نگرانی میں اور آداب ضروریہ کا ہر ممکن پاس ولحاظ کرتے ہوئے اور نفع ونقصان کے اندیشوں سے بے نیاز ہوکر اس کی تعمیرات میں حصہ لیا ہے، یہ بھی ایک قابل قدر اور قابل ذکر بات ہے جس نے ان عمارات کو ایک شاہکار بنادیا ہے۔

حرم مدنی

ملک سعود کے زمانے کی توسیعات وتعمیرات اب زائرین کے لئے تنگ پڑنے لگی تھیں، اسی طرح، مکہ مکرمہ میں حرم مکی کی مسجد بھی حجاج وزائرین کے لئے تنگ پڑنے لگی تھی اسی لئے ملک فہد نے حرمین شریفین کی عمارتوں میں توسیعات وتعمیرات کا ایک جامع منصوبہ بنوایا، اوراس پر عمل کے نتیجہ میں دونوں کی عمارتوں میں تقریباً دوگنا اضافہ ہوگیا۔

مسجد نبوی کے سابقہ رقبہ میں ۸۲۰۰۰ مربع میٹر کا گرانقدر اضافہ کیا گیا ہے۔اس توسیع کے نتیجہ میں مسجد نبوی میں کم از کم ۵ لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہوگئی ہے، نیز سنگ مرمر کے فرش والی چھت پر مزید ۹۰۰۰۰ نمازیوں کی گنجائش ہے، اور اب پوری عمارت کو مکمل طور پر ایرکنڈیشنڈ بنادیا گیا ہے ۔ ایرکنڈیشننگ کا پلانٹ مسجد نبوی سے کافی فاصلے پر قائم کیا گیا ہے تاکہ کسی قسم کا شعور وشغب نمازیوں، ذاکروں اور تلاوت کرنیوالوں کی یکسوئی میں خلل انداز نہ ہو۔

مسجد نبوی (علیہ الصلاۃ والسلام) میں کل آٹھ بلند وبالا مینارے ہیں، جن میں چار مینار جدید توسیع میں بنائے گئے ہیں، ان کی بلندی ۱۰۴ میٹر ہے اور رات کے وقت ان کی ضیا باری قابل دید ہوتی ہے، نئی چھت جدید انداز سے تعمیر کی گئی ہے جو ۲۷ بڑے اجزاء پر مشتمل ہے، ہر جز میں ایسے گنبد ہیں جو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے چند منٹوں میں کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔

پورے حرم میں کل ۴۱ راکتالیس بڑے بڑے دروازے لگے، اور ہر ایک پر نمبر پڑا ہوا ہے تاکہ زائرین کو آنے جانے میں سہولت رہے، اور جس دروازے سے آئے اسی سے واپس بھی جاسکے، عورتوں کی آمد ورفت کے لئے کچھ دروازے مخصوص ہیں جن سے مردوں کا جانا ممنوع ہے، حضور ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کیلئے عورتیں کیلئے اوقات متعین ہیں، ان اوقات میں اس حصے میں مردوں کا جانا منع ہے۔

مسجد نبوی کے ہر دو قدیم صحنوں میں بارہ عدد خودکار چھتریاں لگائی گئی ہیں جو بند ہونے کے بعد چھوٹے میناروں کا روپ دھار لیتی ہیں اور جب کھلتی ہیں تو ان کے آہستہ آہستہ کھلنے کا منظر قابل دید ہوتا ہے، جن ستونوں پر انھیں نصب کیا گیا ہے ان میں لگے ہوئے بلب پورے صحن کو بقعۂ نور بنائے رکھتے ہیں، یہ چھتریاں قیمتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پاکستانی انجینئروں کا کارنامہ ہے۔

غسل خانے اور ضروریات سے فارغ ہونے کیلئے حرم سے متصل مردوں عورتوں کے لئے الگ الگ زیرزمین حمام وغیرہ بنائے گئے ہیں جہاں ہر وقت پانی کا وافر انتظام رہتا ہے اور عام زینوں کے علاوہ متحرک زینے بھی لگائے گئے ہیں۔صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال کے لئے ہر طرح کا عملہ حسب ضرورت موجود رہتا ہے، حج اور رمضان کے موقع پر صفائی ستھرائی کرنیوالا عملہ مزید بڑھا دیا جاتا ہے تاکہ زائرین کو کوئی دشواری اور پریشانی نہ ہو۔

حرم مکی

حج اور رمضان کے مواقع پر حجاج اور زائرین کو جگہ کی تنگی کی وجہ سے بہت دشواری پیش آتی تھی اس لئے ملک فہد نے حرم کی عمارت میں مزید توسیع وتعمیر کا فرمان جاری کیا، چنانچہ مسجد حرام کی موجودہ توسیع کی گئی اس سے بڑی سہولت پیدا ہوگئی۔موجودہ توسیع کے بعد حرم کی گنجائش جو پہلے صرف پانچ لاکھ افراد کے لئے تھی، نو لاکھ افراد تک پہنچ گئی، جس میں سے صرف چھت پر ایک لاکھ ۶۸ ہزار افراد نماز ادا کرسکتے ہیں۔

مسجد الحرام میں مسعیٰ سمیت چھوٹے بڑے ۹۵ بڑے بڑے دروازے ہیں جن میں چار بڑے اور مرکزی دروازے ہیں ۔ باب الفتح، باب العمرہ، باب الملک عبدالعزیز، باب الملک فہد، اوپر کی منزلوں اور نیچے کے تہ خانوں میں آنے جانے کے لئے سادہ اور خودکار زینے لگے ہیں، پوری عمارت نہایت مضبوط، دلکش اور خوبصورت سفید وسیاہ سنگی ٹائلوں سے آراستہ ہے، بلند مینار، خوبصورت دروازے اور خوشنما محرابیں انفرادی شان کی مالک ہیں۔ملحقہ میدان سفید اور ٹھنڈے ٹائلوں سے مزین کئے گئے ہیں جو چلچلاتی دھوپ میں بھی ٹھنڈے رہتے ہیں اور ننگے پاؤں چلنے والوں کو کوئی دشواری نہیں ہوتی، نئی تعمیر شدہ دالانوں اور تہ خانوں کے علاوہ مسعیٰ کو بھی ائرکنڈیشنڈ کردیا گیا ہے۔مسعیٰ کو صفا کی جانب بہت زیادہ کشادہ کردیا گیا ہے اوراس میں ایک بڑی تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ ساتواں شوط مکمل کرنے کے بعد معتمرین وحجاج کو واپس نہیں پلٹنا پڑتا بلکہ مروہ سے ہی حلق یا قصر کے لئے باہر نکلا جاسکتا ہے۔اوپر کی دونوں منزلوں میں بھی یہی انتظام ہے کیونکہ دونوں پلوں کی تعمیر کے بعد معتمرین وحجاج دو مختلف سڑکوں پر بآسانی پہنچ سکتے ہیں، اس طرح رش پر قابو پانا بہت آسان ہوگیا ہے اور اتفاقی حادثات کا امکان بھی بہت کم رہ گیا ہے۔

زمزم پینے کے لئے کنویں کے دونوں جانب مرد وخواتین کا انتظام علیحدہ علیحدہ ہے،اس کے علاوہ پورے حرم میں کولروں میں ٹھنڈا اور سادہ زمزم ہر وقت موجود رہتا ہے، جس سے کسی شخص کو نہ تو کہیں دور جانا پڑتا ہے اور نہ زمزم پینے میں کوئی دشواری ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ زمزم کے کنویں کا راستہ، جو پہلے مطاف میں تھا اب مسعی کی طرف کسی دالان میں منتقل کر دیا گیا ہے،اس طرح اب مطاف میں کوئی چیز ایسی باقی نہیں بچی جو طواف کرنے والوں کے راستے میں حائل ہو۔

عورتوں کے لئے حرم کی دالانوں کے کچھ حصے خاص کر دیئے گئے ہیں جہاں مردوں سے اختلاط نہیں ہوتا اور عورتیں اطمینان وسکون سے عبادت، تلاوت، ذکر وغیرہ میں مشغول رہتی ہیں۔

حرمین شریفین میں بجلی کی سپلائی کے لئے علیحدہ سے انتظام ہے اور اس کے لئے الگ جنریٹر مختص ہیں، حرم مدنی ومکی کے داخلی وخارجی دونوں حصے روشنی کے وافر انتظام کی وجہ سے ہر وقت روشن ومنور رہتے ہیں جس سے حجاج وزائرین کو بہت سہولت ہوتی ہے اور وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حرمین شریفین میں لاؤڈ اسپیکر کا سسٹم مثالی اور عدیم المثال ہے، حج کے زمانے میں مناسک کی رپورٹنگ سعودی عرب کے باہر بھی کی جاتی ہے اور اس سے خاطر خواہ فائدہ بھی ہوتا ہے، سننے میں آیا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں بہت سے افراد حج کے مناظر دیکھ کر مسلمان بھی ہوتے رہتے ہیں، اس طرح گویا تبلیغ ودعوت کا بھی فریضہ ادا ہوجاتا ہے، غیر مسلموں کی ذہن سازی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر حرمین شریفین کی حدود کو ہوائی جہازوں کی آمد ورفت اور شور وشغب سے محفوظ علاقہ قرار دیا گیا ہے اس لئے حرم کی فضاؤں سے کوئی جہاز نہیں گذرتا، البتہ انتظامی ضروریات کی بناء پر ہیلی کاپٹروں کی پرواز اس سے مستثنٰی ہے جو امن وامان برقرار رکھنے اور نگرانی کے لئے ہوتی رہتی ہے۔

حرم کے نزدیک گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے کئی منزلہ زیرزمین عمارتیں بنائی گئیں ہیں۔ اسی طرح اطراف حرمین میں وضو اور استنجا خانوں کے زنانہ ومردانہ حصے علیحدہ علیحدہ ہیں، یہ بھی زیرزمین ہیں اور بہت زیادہ تعداد میں ہیں، صفائی کے لئے مستعد عملہ بھی ہمہ وقت موجود رہتا ہے، خودکار زینے بھی سہولت کے لئے لگا دیئے گئے ہیں۔

حرمین شریفین کے انتظامات اور حفاظتی اقدامات کے لئے وہاں کا عملہ ہمہ وقت مستعد رہتا

ہے، دونوں جگہ صفائی ستھرائی کا نہایت مناسب اور اچھا انتظام ہے، دونوں حرم نہایت عمدہ اور نفیس قالینوں سے مزین رہتے ہیں، رش میں گرنے اور چوٹ لگنے کی صورت میں ابتدائی طبی امداد کا گشتی عملہ بھی موجود رہتا ہے۔ اسی طرح گمشدہ اشیاء کی جمع وتقسیم کا بہترین انتظام بھی ہے، گم شدہ بچوں کا مسئلہ بھی دوسرے مسائل کی طرح بڑا اہم ہے، اس کے لئے الگ سے ایک آفس قائم کیا گیا ہے۔

حرم شریف کے میناروں پر ۱۴ چودہ سرچ لائٹ لگائی گئی ہیں، ہر سرچ لائٹ میں دو بلب ہیں اور ہر بلب کی طاقت ۱۴۵۰۰/واٹ ہے جس سے خاص قسم کی سبز روشنی نکلتی ہے جسکا مقصد دور دراز سے آنیوالے افراد کیلئے حرم کا تعین کرنا ہے تا کہ آنیوالے کو حرم پہنچنے میں کوئی دشوای نہ ہو۔

پورے حرم مکی میں جا بجا بڑی بڑی چار سو پچاس الکٹرانک گھڑیاں لگائی گئی ہیں جن میں تین گھڑیاں حرم شریف کے باہر میدانوں میں لگی ہیں، یہ گھڑیاں دنیا کی مختلف چھ زبانوں میں وقت بھی بتاتی ہیں اور نماز کے اوقات بھی بتاتی ہیں،، اور کچھ گھڑیاں چار ڈائل والی ہیں، کچھ گھڑیاں ایسی ہیں جو عربی اور انگریزی وقت دیتی ہیں اور یہ تمام گھڑیاں ایک مرکزی گھڑی سے منسلک ہیں جو کمپیوٹر سے چلتی ہے۔

زمزم کا پانی ٹھنڈا کرنیکی عمارت میں کمپیوٹر لگایا گیا ہے جو اس بات کی نشادہی کرتا ہے کہ کس پائپ میں کتنا ٹھنڈا پانی جارہا ہے، اور کس پائپ کو کتنے پانی کی ضرورت ہے، اس پلانٹ کیلئے ایک خاص بجلی کا پاور ہاؤس بنایا گیا ہے جسکی طاقت ۴۵۰۰ کیلوواٹ ہے زنانہ اور مردانہ حصوں کے علاوہ حرم شریف کے مختلف حصوں میں ۲۲۷ پائپ لگائے گئے ہیں جن میں ٹھنڈا پانی سپلائی کیا جاتا ہے، پورے حرم شریف میں ٹھنڈے پانی کے پانچ ہزار واٹر کولر ہر وقت رکھے رہتے ہیں اور ہر واٹر کولر میں چالیس لیٹر پانی آتا ہے۔

سچی بات یہی ہے کہ حرمین شریفین کی جونئی توسیع ہوئی ہے واقعی وہ قبل دید داور لائق تعریف ہے، رات کے وقت تمام مینارے خوبصورت لائٹنگ کے سبب بقعۂ نور بنے رہتے ہیں اور حرمین شریفین کا خوبصورت اور دل آویز منظر دلوں میں اتر تا چلا جاتا ہے اور باہر سے آنیوالوں کو سحرزدہ کر دیتا ہے، دیکھنے والے اپنے گردوپیش سے غافل ہوکر ایک نئی اور ان دیکھی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

❁❁❁

حرف آخر

وہی کعبہ مشرفہ جو صدیوں سے جلال خداوندی اور جمال الٰہی کا مظہر ہے، وہی کعبہ جس کے گرد دیوانہ وار چکر لگانے کی تمنا بار بار دل میں پیدا ہوتی ہے، اور وہ مدینہ منورہ جہاں خدا کے محبوب ترین بندے اور افضل ترین رسول محمد ﷺ آرام فرما ہیں، اسی محبوب خدا پر درود و سلام پیش کرنے کی آرزو اب بھی میرے دل میں اور اہل خانہ کے دل میں برابر انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔ اسی ملک، اسی سرزمین، اسی خطہ ارضی میں رہنے اور مرنے کا جی چاہتا ہے جہاں حرمین شریفین کی تجلیاں اور ضوفشانیاں مردہ دلوں کو سیراب کرتی رہتی ہیں ۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

حرمین شریفین کے ذکر کے ساتھ ہی میں اپنی یہ مختصر داستان اس دعاء کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ: اے اللہ! اپنے اس محبوب گھر کا چکر لگانے اور اس کے در پر جبین نیاز جھکانے، اور اپنے محبوب رسول محمد ﷺ کے روضہ پر حاضر ہونے اور آپ ﷺ پر درود شریف کا نذرانہ پیش کرنے کے شرف سے ہم کو ایک بار اور نواز دے۔ (آمین)

﴿ ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار ﴾

❁❁❁

مؤلف کا تعارف چند سطور میں

سید محمد عبدالرحمٰن حسینی

نام : سید محمد عبدالرشید ندوی

تعلیم : "عالمیت" فرسٹ ڈویزن ۱۹۷۱ء دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
"فضیلت" سکنڈ ڈویزن ۱۹۷۳ء دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
"فاضل ادب" فرسٹ ڈویزن ۱۹۷۴ء، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
"بی-اے" فرسٹ ڈویزن ۱۹۷۶ء، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
"بی-اے آنرز" فرسٹ ڈویزن ۱۹۷۷ء، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
"ایم-اے" ۱۹۸۰ء، جامعۃ الامام محمد بن سعود یونیورسٹی، ریاض

معاشی مشاغل : ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک سعودیہ کی منسٹری آف ڈیفنس کے کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے رہے، ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۰ء تک قیادۃ القوات البحریۃ (Navy) ریاض کے کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ میں کام کیا، پھر انڈیا واپس آگئے۔ اب ندوہ کمپیوٹر سنٹر میں کام کر رہے ہیں

علمی مشاغل : ۱۹۶۸ء سے مختلف اخبارات و رسائل میں مضامین لکھتے رہے، جن میں سے، ماہنامہ "فاران" لندن، پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ، ماہنامہ محکمات لکھنؤ، ماہنامہ "سوبرس" دہلی، پندرہ روزہ "ملی اتحاد" دہلی، ماہنامہ بانگ حراء لکھنؤ، ماہنامہ امکان لکھنؤ، روزنامہ "جنگ" کراچی، "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور، اردو ڈائجسٹ، لاہور وغیر قابل ذکر ہیں۔

الف- دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء تک بحیثیت استاد عربی پڑھاتے رہے۔
ب- ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۶ء تک ماہنامہ "محکمات" کانپور کے معاون ایڈیٹر رہے۔
ج- دس اردو اور ایک عربی کتاب کے مؤلف ہیں۔
د- آل انڈیا ملی کونسل ریاض اور "مجلس ابنائے ندوہ، ریاض کے ممبر اور خازن رہے۔

موجودہ مشغلہ : جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور کے جنرل سکریٹری ہیں۔
ماہنامہ "بانگ حراء" لکھنؤ کے ایڈیٹر ہیں۔
اور ندوہ کمپیوٹر سنٹر، لکھنؤ کے منیجر ہیں۔

❁❁❁